ڈاکٹر محمد اسلام نے اپنے مقالہ "جگر مرادآبادی، حیات اور شاعری" پر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، معارف میں ان کی کئی کتابوں کا تعارف کرایا جا چکا ہے اب وہ تین چھوٹے چھوٹے رسالوں کے اور مصنف ہو گئے ہیں۔ "جگر معاصرین و مخلصین کی نظر میں" جگر کے متعلق ان کے عزیزوں، شاگردوں اور معاصرین کے دلچسپ تاثرات ہیں، اس میں جگر کے علاوہ خود ان کے احباب کی شخصیت و شاعری کے متعلق بھی معلومات ہیں، اکثر تاثرات عقیدت مندانہ ہیں لیکن بعض میں جگر کی شخصیت و شاعری کے کمزور پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، دوسرے رسالہ "بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو" میں اصغر، فانی، جگر، اثر اور فراق کے مختصر حالات اور ان کی شاعری پر مختصر تبصرہ کے ساتھ ان کے کلام کے نمونے مختلف عنوانات کے تحت دیئے گئے ہیں۔ "مختصر تاریخ غزل اردو" میں شروع سے اب تک کی غزلیہ شاعری کی مختصر تاریخ ۹ دوروں میں بیان کی گئی ہے، امید ہے کہ یہ رسالے طلبہ کے لئے مفید ہوں گے، ڈاکٹر محمد اسلام میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے اس لئے امید ہے کہ آیندہ وہ چھوٹے چھوٹے رسالے لکھنے کے بجائے اہم موضوعات پر مضامین اور کتابیں لکھ کر اپنی محنت و خوش مذاقی کا ثبوت دیں گے۔

انتخاب اردو۔ مرتبین کا نام تحریر نہیں، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات ۲۸۰ قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے، پتہ ادبی پبلشرز، ۲۵ شیفرڈ روڈ بمبئی ۸

اردو کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب برابر شائع ہوتا رہتا ہے، زیر نظر انتخاب مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے ایس ایس سی امتحانات ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۹ء کے لئے شائع کیا ہے، پہلا حصہ تفصیلی مطالعہ کے لئے ہے، اس میں ۸ مضامین ہیں، مضامین اور نظموں کے انتخاب میں رنگا رنگی کے ساتھ حسن ذوق کا پورا ثبوت ہے، امید ہے کہ یہ انتخاب نہ صرف مہاراشٹر بلکہ اس سے باہر کے تعلیمی مدارس میں بھی مقبول ہوگا۔

"ض"

جلد ۹۹ ۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۶۷ء ۔ عدد ۵

مضامین

شذرات

اردو ادب مخالف حالات میں بھی جس طرح ترقی کر رہا ہے وہ اردو زبان کی مقبولیت کی دلیل ہے لیکن اگر اس کی تعلیم کا دروازہ بند رہا تو ایک دو نسلوں کے بعد اس کا خاتمہ یقینی ہے، یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ بہت سے اونچے مسلمان گھرانوں کے لڑکے اردو لکھنے پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتے، اس میں حکومت سے زیادہ ان کے والدین کا قصور ہے، اردو کے معاملہ میں زبانی دعووں کے باوجود تمام پارٹیوں کا نقطۂ نظر ایک ہے، جب کانگریس کی حکومت اپنے اعلیٰ اصولوں، اقلیتوں کے دستوری تحفظات اور سیکولرزم کے دعوی کے باوجود بیس[۲۰] سال کی طویل مدت میں اردو کے لیے کچھ نہ کر سکی تو متضاد عناصر کی معجون مرکب حکومتوں سے جن کو خود کوئی ثبات و قرار نہیں، کیا امید کیجا سکتی ہے، جس کا تجربہ بھی شروع ہو گیا ہے، یہ ذکر ضمناً آگیا، اصلی مقصود یہ دکھانا ہے کہ اردو کا دامن کمیت کے لحاظ سے تو بلاشبہہ وسیع ہو رہا ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے سمٹ رہا ہے، اردو کے بیشتر ادیبوں اور اصحاب قلم کی پرواز شعر و ادب، انکی تنقید، ترقی پسند ادب اور افسانوں سے آگے نہیں بڑھتی، نو مشق بھی اسی سے طبع آزمائی کی ابتدا کرتے ہیں، اسلیے انکی تو اتنی بہتات ہو گئی ہے کہ ان سے دل گھبرانے لگا ہے لیکن ادبیات کے دائرہ میں علمی و تحقیقی کاموں کی بڑی کمی ہے، یہ غنیمت ہے کہ یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں میں ان کے اساتذہ کے ذوق کے مطابق تحقیقی کام بھی ہو رہے ہیں جنکی بدولت اردو زبان و ادب سے متعلق بعض اہم اور مفید کتابیں اور تحقیقی مقالات نظر آجاتے ہیں لیکن ادبیات کے دائرہ کے باہر علم و فن کی دوسری اصناف اور علمی مسائل و مباحث پر تحقیقات و تصانیف کی رفتار بہت سست ہو گئی ہے، بلکہ اس کا پرانا ذخیرہ بھی نایاب ہوتا جاتا ہے،

اس کے مقابلہ میں پاکستان میں اردو کا دامن علمی حیثیت سے وسیع ہو رہا ہے، پورے ہندوستان میں

لے دے کر چند علمی و ادبی ادارے ہیں، وہ جس طرح چل رہے ہیں اُن کے کارکن ہی جانتے ہیں، اس کے مقابلہ میں پاکستان میں پرانے ادارے بھی موجود ہیں اور نئے نئے برابر قائم ہوتے جاتے ہیں، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، اقبال اکیڈمی لاہور، ادارۂ تحقیقات پاکستان، لاہور یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور اگرچہ تعلیمی ادارہ ہے لیکن اس کی خدمات کسی علمی ادارے سے کم نہیں ہیں، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، انجمن ترقی اردو کراچی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اکیڈمی کراچی، ادارۂ تحقیقات اسلامی راولپنڈی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد، جماعت اسلامی، یہ چند اہم نام ہیں، ان کے علاوہ اور بھی اشاعتی ادارے ہیں، یہ سب نہایت مفید علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے علاوہ ایسے بہت سے تاجران کتب ہیں جن کی خدمات علمی اداروں سے کم نہیں ہیں، اور ان کی حیثیت چھوٹے پیمانہ پر پرانے نولکشور بک ڈپو کی ہے، جو نہ صرف مختلف علوم کی اور اہم مسائل و مباحث پر نئی نئی کتابیں شائع کرتے ہیں بلکہ انھوں نے اردو کی نایاب کلاسیکل اور عربی و فارسی کی اہم مذہبی، علمی اور تاریخی کتابوں کے اردو تراجم کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے، جو بڑا مفید کام ہے، اس طرح پاکستان میں اردو زبان میں مختلف علوم اور موضوعوں پر نئی علمی و تحقیقی اور پرانی کلاسیکل کتابوں کا بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے،

ہندوستان میں اردو کے صرف چند معیاری اخبار اور رسالے نکلتے ہیں، پاکستان کی مذکورۂ بالا تمام اکیڈمیوں کے بلند پایہ اور معیاری رسالے بھی ہیں، اردو کے اخبارات کا معیار ہندوستان کے اخبارات سے بہت اونچا ہے، ان کی جتنی اشاعت ہے اور ان کے اڈیٹروں اور نامہ نگاروں کو جو معاوضہ ملتا ہے، اس کا ہندوستان میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں اردو کی کتابوں، اس کے اخبارات و رسائل پڑھنے کا عام ذوق ہے، اور ہندوستان کے ادیب اور اردو کے خدمت گذار تک اس کو اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں،

یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں اردو کی ترقی میں حکومت کی امداد و سرپرستی کو بھی دخل ہے، اردو حکومت

کی سرکاری زبان ہے، پاکستان مسلمانوں کی کثرت کا ملک ہو، اس لیے اردو کو ترقی کے جو مواقع وہاں حاصل ہیں وہ ہندوستان میں نہیں ہیں، اور اردو کتابوں کی جتنی مانگ وہاں ہو یہاں نہیں ہوسکتی، مگر یہ بھی واضح رہے کہ اس ترقی میں زیادہ بلکہ قریب قریب کل حصہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں کا ہو جنکی تعداد ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت کم ہے، اور انکی مادری زبان بھی اردو نہیں ہے ہندوستان میں آج بھی چھ کروڑ مسلمان ہیں، ان میں سے بڑی تعداد کی مادری زبان اردو ہے، اگر تنہا وہی اردو کی خدمت اور علمی حیثیت سے اس کو ترقی دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو بھی کافی ہیں، ادبی خدمت میں تو ہندو ادیبوں کا قدم بھی مسلمانوں سے پیچھے نہیں ہے، البتہ اس کا اعتراف ہو کہ شعر و ادب کے میدان میں ہندوستان کے شعرا و ادیبوں کی خدمات زیادہ ہیں، انھوں نے شعر و ادب کا ایسا بلند معیار قائم کر دیا جس سے پاکستان کو بھی فائدہ پہنچا، اس میں شبہہ نہیں کہ زبان میں ادب کا بھی ایک مقام ہو لیکن زبانیں محض ادب کے سہارے نہیں بلکہ علم و فن سے ترقی کرتی ہیں۔

زہد و رقاق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں حضرت عبد اللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقاق اہم اور قدیم ترین کتابوں میں ہو، جو ابتک غیر مطبوعہ تھی، اور اس کے قلمی نسخے بھی کمیاب تھے، مولانا حبیب الرحمن اعظمی جنانے ان کے فوٹو حاصل کرکے ان کی مدد سے اس کتاب کو تصحیح و تحشیہ اور ترتیب و تہذیب کے جملہ لوازم کے ساتھ مرتب کیا، اور مجلس احیاء المعارف الیگاؤں ناسک نے اس کو اہتمام کے ساتھ خوبصورت ٹائپ میں چھپوا کر شائع کیا ہے، فاضل مرتب نے حواشی میں اختلافِ نسخ کے ساتھ متن کے اغلاط کی تصحیح، اس کے مشکل الفاظ کی تشریح اور احادیث کی تخریج بھی کی ہو، کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہو جس میں کتاب اور مصنف کے حالات کے ساتھ اور بہت سے مفید اور اہم معلومات بھی آگئے ہیں، مرتب کی محنت اور تلاش و تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہوسکتا ہو، اسکی کتابت، ترتیب اشاعت سے ایک مفید اور اہم دینی خدمت انجام پائی ہو جس کے لیے فاضل مرتب و ناشر دونوں اہل قلم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مقالات

مشکل الآثار

از

جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

امام طحاوی کی ایک اہم ترین تالیف مشکل الآثار ہے، اس کی سات جلدیں استنبول کے مکتبۂ فیض اللہ میں موجود ہیں[1]، دائرۃ المعارف النظامیہ نے اس کو نا تمام صورت میں ۴ جلدوں میں شائع کیا ہے، یہی حصہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کے مطالعہ کے دوران میں اسکے جو اہم خصوصیات سامنے آئے اُن کو اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے،

مقصد تالیف امام طحاوی نے خود اسکا موضوع و مقصد تالیف یہ بتایا ہے کہ "ثقہ و ثابت رواۃ سے مروی مسند و مقبول حدیثوں کی معرفت وغیرہ کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت دیکھکر میں نے ان پر غور و تامل کیا، اس کے نتیجہ میں جو مشکلات اور حدیثوں سے جو مسائل و احکام مستنبط ہوئے ان کو بیان کرکے ان پر عائد ہونے والے اعتراضات اور اشکالات کو دفع کرنے کی کوشش کی ہے"[2]،

طریقۂ تصنیف مشکل الآثار کی ترتیب و تصنیف اور نقلِ روایت و حدیث کا عام انداز یہ ہو کہ پہلے ایک حدیث ذکر کرکے اس کے متابعات اور مؤید حدیثیں بیان کی گئی ہیں، متابعات میں زیادہ تر

---

[1] الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۴ [2] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳

فرق واختلاف کو ظاہر کیا گیا ہے، لیکن اگر کسی روایت میں کوئی خاص اضافہ یا کمی ہو تو اس کو بھی ذکر کیا گیا ہے، پھر روایت کا صحیح مدلول ومنشا متعین کرکے اس پر عائد ہونے والے شبہات یا دوسری حدیثوں سے ان کے اختلاف کی نوعیت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ثبوت واستدلال میں قرآنی آیات، احادیث، آثار صحابہ وتابعین، ائمہ مجتہدین اور فقہائے کے اقوال وآرا بھی ضرورت کے مطابق بیان کیے گئے ہیں، نحوی ولغوی مسائل پر بحث وگفتگو اور کلام عرب سے بھی کہیں کہیں شواہد پیش کیے گئے ہیں، روایت کے اسناد ومتون، اس کی صحت وضعف اور رواۃ وغیرہ کے متعلق بھی مفید اور ضروری معلومات نقل کیے گئے ہیں،

احادیث میں تضاد وتعارض نہیں

امام طحاوی سب سے پہلے اس اصول کو بیان کرتے ہیں کہ درحقیقت کلام رسول میں تعارض اور تناقض سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے اس لیے خطاب کیا ہے کہ اس کو دین کے حدود وضوابط اور آداب واحکام سے واقف کرائیں، اس لیے ارباب دانش کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ آپ کے احکام وحدود میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا، اگر آپ کے ایک خطاب اور دوسرے خطاب کے الفاظ مختلف معلوم ہوں تو اس کی وہی نوعیت ہے جو زیر بحث حدیث کے سلسلہ میں ہم نے بیان کی ہے، لیکن اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ بات ہو کہ آپ کے خطاب میں تضاد ہے تو اس کو تلاش وتحقیق سے کام لینا چاہیے، اگر اس سے اس کا خلجان رفع نہ ہو تو اس کو اپنے قصور علم وفہم کا اعتراف کرنا چاہیے، کیونکہ احادیث میں درحقیقت اختلاف نہیں ہوتا، جب خدا نے رسول کے صدق کی ضمانت اور ذمہ داری لی ہے، تو پھر اس کے کلام میں تناقض کو کیسے باور کیا جا سکتا ہے، البتہ

ولو کان من عند غیر اللہ   اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو

لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً (نساء۔۱۰)[1]   ضرور لوگ اس میں تفاوت پاتے

امام طحاوی نے اس سلسلہ میں بحث واستدلال کا جو انداز اختیار کیا ہے اس سے ہمارے زمانہ کے منکرین حدیث وروایت کے بعض اعتراضات کا تشفی بخش جواب بھی ہو جاتا ہے، کیونکہ ان کا سب سے بڑا سہارا احادیث کا ظاہری فرق واختلاف ہے، اسی بنیاد پر وہ اکثر حدیثوں کو واہی، ضعیف اور ناقابل عمل ورد قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ ان کے قلت تدبر اور کم فہمی کا نتیجہ ہے، مثلاً

عمر بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ماں کے گھر میں کھانا تناول فرما رہے تھے، میں داخل ہوا تو فرمایا کہ "اللہ کا نام لیکر دائیں ہاتھ سے اپنے سامنے اور قریب کا کھانا کھاؤ"۔ اس کے بعد میں ہمیشہ اسی پر عمل کرتا رہا، دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پیالہ کے بیچ میں برکت نازل ہوتی ہے اس لیے بیچ سے کھانے کے بجائے پیالہ کے کناروں سے کھانا چاہیے"

امام طحاوی نے ان روایتوں کی اسناد وغیرہ پر محققانہ بحث کرکے لکھا ہے کہ دونوں روایتوں میں فی الواقع کوئی تضاد نہیں ہے، ابن عباسؓ کی روایت میں کناروں سے کھانے کا منشا بھی یہی ہے کہ آدمی صرف اپنے سامنے اور قریب کے کنارے سے کھائے لیکن اگر اس سے پیالے کے سب کناروں سے کھانے کی اجازت اور گنجائش بھی نکل آئے تو حدیث کی مناسب توجیہ یہ ہوگی کہ اس میں تنہا کھانے والے کے متعلق ہدایت بیان کی گئی ہے، دسترخوان پر اور کئی آدمیوں کے ساتھ ایک برتن میں کھانے کے متعلق اس میں کوئی ہدایت نہیں ہے، اس کا ذکر پہلی روایت میں ہے کہ جب آدمی متعدد لوگوں کے ساتھ ایک برتن میں کھائے تو ہر شخص کو اپنے قریب اور سامنے کے کنارے سے کھانا چاہیے، جو ادب اور شائستگی کا بھی تقاضا ہے، حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا جو مفہوم

---

[1] مشکل الآثار ج۱ ص ۲۰۹ و ۲۱۰

اس صورت میں بیان کیا گیا ہے، اس کی تائید دوسری حدیثوں سے بھی ہوتی ہے، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تنہا کھانا تناول فرماتے تھے تو پیالہ کے مختلف حصوں اور جس جگہ سے چاہتے تھے کھانا تناول فرماتے۔" اس توجیہہ سے تضاد خود بخود دفع ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر روایت کا مفہوم الگ الگ اور جدا جدا ہے[1]،

منکرین حدیث بعض حدیثوں کی اس لیے بھی تردید کرتے ہیں کہ وہ بظاہر منطوق قرآنی کے خلاف معلوم ہوتی ہیں حالانکہ واقعہ اس سے مختلف ہوتا ہے، مثلاً حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ تم لوگ یہ آیت پڑھتے ہو:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ — اے ایمان والو تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا،

لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ — تمھارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم ہوئے راہ پر،

حالانکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

ان الناس اذا رأوا الظالم فلم یاخذوا — اگر لوگ ظالم کو اس کے ظلم سے باز نہ

علی یدیہ یوشک ان یعمھم — رکھیں تو اللہ ظالمین کے ساتھ ان کو

اللہ بعقاب — بھی سزا دے گا۔

اس بارہ میں بعض روایتیں بھی ہیں جن میں کچھ فرق و اختلاف پایا جاتا ہے، ایک روایت میں ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم لوگ یہ آیت [یایھا الذین اٰمنوا] پڑھتے ہو لیکن اللہ نے اس کو جس محل و مقام میں رکھا ہے تم اس محل و مقام میں اس کو نہیں رکھتے، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

اذا عمل فیھم بالمعاصی او — جب گناہ اور ناحق کے کام کیے جائیں

[1] مشکل الآثار، ج اول از صفحہ ۵۲ تا ۵۴

بغیر الحق ثم لم یغیروہ یوشک — اور (صالح لوگ) اس کو نہ بدلیں تو اللہ

ان یعمھم اللہ بعقاب منہ — سب کو عذاب دے گا۔

اس روایت میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ زیادہ مناسب اور حضرت ابوبکرؓ کے شایان شان معلوم ہوتی ہے، اس لیے دوسرے صحابہ کے مرویات کو سامنے رکھکر آیت کا محل و مقام معلوم کرنے کی ضرورت ہے، ابوامیہ نے ابوثعلبہؓ خشنی سے اس آیت کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "تم لوگ نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرتے رہو یہاں تک کہ جب یہ دیکھو کہ شح و ہوائے نفس کی پیروی کیجاتی ہے، دنیا کو ترجیح دیجاتی ہے، ہر شخص اپنی رائے پر فریفتہ اور مگن ہے، اور صورت حال اتنی خراب ہوگئی ہے کہ نیکی کی تلقین اور برائی کی مذمت کرنے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہ گئی ہے تو صرف اپنی فکر کرو اور عام لوگوں کے معاملات سے تعرض نہ کرو، کیونکہ اس کے بعد ایسا وقت آئیگا جس میں صبر کرنا ویسے ہی دشوار ہوگا، جیسے چنگاری اور آگ کے شعلہ کو ہاتھ میں لینا مشکل ہے، ایسے نازک وقت میں عمل کرنے والے کو پانچسو گنا زیادہ اجر ملے گا، اس حدیث سے حضرت ابوبکرؓ کے قول کا صحیح منشا معلوم ہو گیا کہ جس زمانہ میں اس آیت پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، اسی میں اسپر عمل کیا جائیگا اور اس زمانہ کی تشریح ابوثعلبہؓ کی روایت میں مذکور ہے، ورنہ عام حالات میں اللہ نے اپنے بندوں پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکے علاوہ متعدد روایتیں موجود ہیں، جن میں اس کی تاکید اور اس کے ترک کے سنگین نتائج سے خبردار کیا گیا ہے، البتہ اگر ایسا زمانہ آجائے جس کا ذکر حضرت ابوثعلبہؓ نے کیا ہے تو آدمی کی ذمہ داری صرف اپنی ہی حد تک محدود ہو جاتی ہے، اور دوسروں کو گمراہی سے نہ روکنا اس کے لیے تباہ کن نہیں ہوتا

علمائے تاویل کی ایک جماعت نے تو مذکورۂ بالا آیت کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ اس میں فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سقوط کا کوئی ذکر نہیں ہے، یہ لوگ اپنی تائید میں متعدد آیتیں بطور ثبوت پیش کرتے ہیں، ایک آیت ہے

لیس علیک ھدٰھم ولکن	ان لوگوں کو راہ پر لانا تیرے ذمہ نہیں،
اللہ یھدی من یشآء (بقرہ)	اللہ جس کو چاہے راہ پر لائے،

اس آیت سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کہ تبلیغ وہدایت فرائض نبوت میں داخل نہیں ہے، بلکہ تبلیغ وہدایت تو درکنار، دشمنان دین سے جہاد وقتال کرنا بھی نبی کا فرض ہے، تاآنکہ لوگ امر الٰہی کے سامنے سرنگندہ ہوکر دین حق کو اختیار نہ کرلیں۔[1]

منکرین حدیث بعض اوقات کمزور روایتوں کو صحیح روایتوں کے معارض قرار دے کر انکار حدیث کا سامان فراہم کرتے ہیں، امام طحاوی کی دوربیں نگاہوں نے اس اشکال کو بھی حل کیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے "عید کے دونوں مہینے یعنی رمضان اور ذی الحجہ ناتمام اور ناقص نہیں ہوتے"۔ اس پر جو شبہات ہوتے ہیں ان کو رفع کرنے کے لیے پہلے وہ یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "چاند دیکھکر روزہ رکھو اور افطار کرو اور اگر چاند نظر نہ آئے تو ۳۰ دن پورے کرلو" اس سے ظاہر ہوگیا کہ رمضان کا مہینہ بھی ۲۹ دنوں کا ہوتا ہے، البتہ اس کی حیثیت دوسرے مہینوں سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں روزہ رکھا جاتا ہے، غالباً اسی وجہ سے عام ذہنوں میں یہ شبہہ پیدا ہوا ہوگا کہ ۲۹ کو چاند ہونے سے روزہ میں نقص پیدا ہوجائے گا، اس لیے آپ نے فرمایا کہ چاند چاہے ۲۹ کو ہو یا ۳۰ کو ان دونوں مہینوں کی فضیلت اور خصوصیت میں فرق نہیں آسکتا، اس توجیہ سے ظاہری تضاد خود بخود رفع ہوگیا، لیکن اسکے

---

[1] مشکل الآثار ج ۲ ص ۶۲ تا ۶۶

متعلق یہ جو روایت کی گئی ہے کہ "ہر محترم ومقدس مہینہ ۳۰ ہی دن کا ہوتا ہے" وہ صحیح نہیں ہے، اسلیے کہ اس کے راوی عبد الرحمٰن بن اسحٰق کا پایہ حفظ وضبط اور ثقاہت کے اعتبار سے گذشتہ روایت کے راوی خالد حزا سے بہت کمتر ہے، دوسرے یہ روایت مشاہدہ اور بداہت کے بھی سراسر خلاف ہے۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ احادیث وروایات میں جو تضاد واختلاف نظر آتا ہے وہ عموماً ان کے موقع ومحل، وقت وزمانہ، تقیید واطلاق، تخصیص وتعمیم اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے، جس سے منکرین حدیث غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، امام طحاوی نے ان سب پہلوؤں پر اس کتاب میں بحث کی ہے، لیکن طوالت کے خوف سے انکو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

صحابہ وتابعین اور ائمہ وفقہا کے اختلافات

اس کتاب میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و فتاوی بھی نقل کیے گئے ہیں، اور ان کے اختلافات کی نوعیت، ان کے درمیان توجیہ وتطبیق وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اگر اختلافات میں تطبیق کی صورت نظر نہیں آتی ہے تو وہ اولیٰ اور مرجح قول کو ذکر کرتے ہیں، ان مسائل ومباحث سے امام طحاوی کی فقہ واجتہاد میں عظمت وبرتری کا اندازہ ہوتا ہے۔

طحاوی مقلد جامد نہیں

امام طحاوی کا شمار اُن علمائے احناف میں ہے جن کا حنفی مذہب کی ترویج واشاعت میں بڑا حصہ ہے، لیکن وہ مقلد جامد نہیں ہیں، اور احادیث کی سند کے بغیر کسی مسئلہ کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے نزدیک اصل مرجع رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، فرماتے ہیں:۔

"اصلی نمونہ تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، اس لیے آپکے ارشاد کے

---

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۲۲

مقابلہ میں ائمہ کی رائے رد کر دی جائے گی"[۱]

ایک جگہ اساطین احناف میں امام زفرؒ کے بارہ میں لکھتے ہیں :-

"امام زفرؒ کا یہ مسلک ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے جو کچھ روایت کی ہے وہ ہمارے نزدیک اولیٰ و احسن ہے"[۲]

آثار صحابہ کے بارہ میں لکھتے ہیں :-

"صحابہ کی مخالفت اور ان کے مذہب و مسلک سے انحراف سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں، اس کی نوعیت کتاب الٰہی سے اسکیا رد و انحراف کی ہے، جو شخص کتاب اللہ، سنت رسول، اصحاب اور تابعین کے مسلک سے اعراض و انحراف کریگا اللہ اس کو فہم قرآن سے محروم کر دے گا"[۳]

مطلقہ کے نفقہ و سکنی کے متعلق احادیث اور فقہاء کے اختلافات نقل کر کے فرماتے ہیں :-

"ہم جو باتیں تحریر کر چکے ہیں وہ ان علماء (احناف) کے اقوال کے مقابلہ میں زیادہ صحیح و ثابت ہیں"[۴]

ایک مسئلہ میں امام مالک کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"امام مالکؒ نے اس بارہ میں جو کچھ فرمایا ہے وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے قول سے بہتر ہے، اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول امام دار الہجرت کے قول سے قریب تر ہے"[۵]

مشکلات کا حل | کتاب میں اصلاً مشکلات حدیث کا جائزہ لیکر ان کا مفصل اور محققانہ جواب دیا گیا ہے، اس کی مثالیں کبثرت ہیں، لیکن کتاب کی صحیح نوعیت ظاہر کرنے کے لیے صرف ایک مثال درج کیجاتی ہے، احادیث صحیحہ میں حضرت ابی بن کعبؓ کو اقرءہم لکتاب اللہ (کتاب اللہ کے سب سے بڑے قاری و عالم)، حضرت معاذ بن جبلؓ کو اعلمہم بالحلال والحرام (حلال و حرام سے بہت زیادہ واقفیت رکھنے والے) اور حضرت زید بن ثابتؓ کو افرضہم (علم الفرائض کے بڑے ماہر) کہا گیا ہے، اس لیے یہ سوال

---

[۱] مشکل الآثار ج ۳ ص ۳۶۲ [۲] ایضاً ص ۱۰۰ [۳] ایضاً ج ۱ ص ۳۰۵ [۴] ایضاً ج ۳ ص ۲۷۵ [۵] ایضاً ج ۴ ص ۱۱

پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حضرات خلفائے راشدین اور دوسرے اجلہ صحابہ سے بھی ان خصوصیات کے اعتبار سے فائق و برتر اور وہ لوگ ان سے فروتر تھے، امام طحاوی اسکا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اگر کوئی شخص کسی وصف میں اتنا بلند مرتبہ ہو کہ اس وصف میں عام لوگوں کے اعتبار سے وہ زیادہ ممتاز اور نمایاں ہو تو اس کے بارہ میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ اس وصف میں افضل و برتر (افضل الناس) ہے، اگرچہ اس وصف میں اس پایہ بلکہ اس سے بھی ممتاز، بلند مرتبہ اور فائق تر لوگ موجود ہوں۔ چونکہ وہ اس فن میں یک گونہ خصوصیت اور امتیاز رکھتا ہے اس لیے اس کو افضل کہا جا سکتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے متعلق فرمایا تھا کہ

یقتلہ اشقی البریۃ — ان کو بدترین خلائق قتل کرے گا

حالانکہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ابن ملجم جس نے جناب امیرؓ کو قتل کیا تھا موحد تھا، تاہم اپنے اسکے ایک نہایت مذموم اور شنیع فعل کی بنا پر اسکو اشقی البریہ کہا، یہ اس لیے کہ اس کے دوسرے جرائم اور معصیتوں کے مقابلہ میں اس کا یہ سب سے زیادہ شنیع اور سنگین جرم تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے مقابلہ میں وہ شخص زیادہ بدبخت اور اشقی ہے جو سرے سے توحید کا منکر ہو اور دوسروں کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہو، اسی طرح آپ نے خوارج کے بارہ میں فرمایا ہے

ھم شرار الخلق والخلیقۃ — وہ لوگ بدترین خلائق ہیں

ظاہر ہے کہ خدا کو نہ ماننے والے، اس کا شریک و ساجھی ٹھہرانے والے اور انبیاء و رسل کی تکذیب کرنے والے خوارج سے بھی بدتر اور برے ہیں، اس سے ظاہر ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کسی وصف میں زیادہ ممتاز اور کسی خصوصیت کے لحاظ سے عام لوگوں میں زیادہ نمایاں ہو تو

باوجودیکہ اس وصف کے ویسے ہی ...... یا اس سے بھی بہتر دوسرے لوگ موجود ہوں اس کو فائق و افضل کہا جا سکتا ہے، اسی حیثیت سے آپ نے ان حضرات کو بھی فائق کہا ہے، کیونکہ وہ لوگ ان فنون میں زیادہ ممتاز اور برتر تھے لیکن اس سے یہ قیاس نہیں کرنا چاہیے کہ دوسرے تمام ہی صحابہ ان چیزوں میں ان سے کمتر تھے،

دوسری چیز یہ ہے کہ اس طرح کے مواقع پر قائل کا منشا و مقصد عام طور پر لوگوں کو معلوم ہوتا ہے اور وہ مخاطب کی رعایت اور اس کے علم کا اندازہ کر کے بات کہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے راسخین کو بے تکلف اعلم الناس کہہ دیا جاتا ہے، حالانکہ کسی کو اعلم الناس کہنے والا اور لوگوں سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے اور نہ اس کو سارے لوگوں کے علم کے متعلق کوئی اندازہ ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائل کی ایک خاص مراد ہوتی ہے جس کو مخاطب سمجھتے ہیں، اس طرح گویا یہ بطور مجاز کہا جاتا ہے، حقیقت سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا[1]"

قوت واستدلال اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت اس کی قوتِ استدلال ہے، اس کا اندازہ اس مثال سے ہوگا، طحاوی فرماتے ہیں:-

"تارکِ صلوٰۃ کے حکم کے متعلق اہل علم میں اختلاف ہے، بعض لوگوں کے نزدیک ایسا شخص مرتد ہے، اگر وہ توبہ نہیں کرتا تو قتل کر دیا جائے گا، یہ امام شافعی کا قول ہے، لیکن دوسرے علماء کے نزدیک ایسا شخص فاسق اور اہل کبائر میں ہے، اس کو مرتد نہیں کہا جا سکتا، امام ابو حنیفہ کا مسلک یہی ہے، اور ہمارے نزدیک بھی یہ زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بعض ایسے فرائض مقرر کیے ہیں جن کا مخصوص وقتوں میں آدمی مکلف ہوتا ہے پانچوں وقتوں کی نمازیں اس ضمن میں آتی ہیں، یہی حال رمضان کے روزوں کا بھی ہے

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۵۰-۳۵۴

اب اگر کوئی شخص قصداً رمضان کے مہینے کے روزے ترک کر دے مگر وہ ان کی فرضیت کا منکر نہ ہو تو وہ مرتد اور کافر نہیں ہوگا، اسی طرح اگر کوئی شخص انکار و کفر کی وجہ سے نماز ترک نہیں کرتا تو اس کو مرتد اور خارج از اسلام نہیں قرار دے سکتے، اس کی بڑی واضح دلیل یہ ہے کہ ہم ایسے شخص کو نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں لیکن کافر کو نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیتے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص محض ترک صلوٰۃ کی بنا پر کافر ہو گیا ہوتا تو پہلے ہم اس کو اسلام کی تجدید کی دعوت دیتے اور جب وہ اسلام قبول کر لیتا تو اس کے بعد اس کو نماز کا حکم دیتے، لیکن جب ہم ایسا نہیں کرتے بلکہ اس کو صرف نماز کی تلقین کرتے ہیں تو یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ شخص ترک صلوٰۃ کے باوجود مسلمان رہتا ہے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں قصداً روزہ توڑنے والے کو کفارہ کا حکم دیا تھا، اس کفارہ میں روزہ بھی شامل تھا، اور ظاہر ہے کہ روزہ ایک مسلمان ہی رکھے گا،

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ آدمی اقرار اسلام کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے، حالانکہ ابھی اس نے ان واجبات و فرائض کو جو اسلام نے مسلمانوں پر عائد کیے ہیں یعنی نماز اور روزے وغیرہ انجام نہیں دیا ہے، ٹھیک اسی طرح اگر وہ مسلمان ہو کر ان کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کو کافر و مرتد نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ سرے سے انکار نہ کر دے، اس سے واضح ہو گیا کہ تارک صلوٰۃ کافر و مرتد نہیں ہے[1]"

امام طحاوی نے بحث و استدلال کی طرح تحقیق و کاوش کا بھی پورا حق ادا کیا ہے، خصوصاً بعض مسائل مثلاً کل صلوٰۃ لم یقرء فیہا بام القرآن فہی خداج اور انزل القرآن علی سبعۃ احرف، نیز سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کے درمیان بسم اللہ نہ ہونے کے وجہ پر انھوں نے بڑی مفصل

[1] مشکل الآثار

اور محققانہ بحثیں کی ہیں، لیکن ان کو نقل کرنا موجب طوالت ہے۔

قرآنی آیتوں کی تشریح امام طحاوی ان آیتوں کی جو کسی خاص حدیث میں مذکور ہیں تشریح کرتے ہیں، ان کے مفہوم و منشا کو واضح کرتے ہیں، اسی طرح بعض حدیثوں کی تشریح میں وہ قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہیں، قرآن کے مشکل الفاظ و کلمات کے معنی و مفہوم کی جانب اشارہ کرتے اور انکی توضیح فرماتے ہیں، سبب نزول اور شان نزول وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہیں،

اصول حدیث کی بحث اصول روایت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے، مصنف نے احادیث کی صحت و عدم صحت، رجال و اسناد کی تحقیق اور اصول حدیث وغیرہ پر بڑی عالمانہ اور محققانہ بحثیں کی ہیں، وہ جب کوئی حدیث نقل کرتے ہیں تو پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط، اگر صحیح ہے تو اس کے وجوہ اور غلط ہے تو اس کے اسباب و علل بیان کرتے ہیں، اسی طرح حدیث منقطع ہے یا متصل، موقوف ہے یا مسند، مرسل ہے یا مرفوع، غریب و منکر ہے یا مقبول و مشہور، ضعیف اور فاسد الاسناد ہے یا قوی، حسن اور صحیح الاسناد، راوی ثقہ و ضابط ہے یا غیر ثقہ اور مجہول الحال، مدلس ہے یا غیر مدلس، شذوذ و تفرد سے اس نے کام لیا ہے یا دوسرے راویوں نے اس کی موافقت اور متابعت کی ہے، اس کو وہم و شک ہوا ہے یا نہیں؟ نفس روایت کے اندر اس سے کیا سہو یا خطا ہوئی ہے، راوی نے کوئی اضافہ یا کمی کی ہے تو اسکی نوعیت کیا ہے؟ ایک قسم کی متعدد روایتوں کو بھی اس لیے نقل کرتے ہیں کہ ان کا باہمی اختلاف اور کمی بیشی نمایاں ہو جائے، راوی کے ابہام، دوسرے راوی سے سماع و عدم سماع اور اسماء و اعلام کے متعلق بعض وضاحتیں وغیرہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں، اس کی مزید وضاحت کے لیے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ایک روایت جس میں یوم الحج الاکبر (حج اکبر کا دن) کا ذکر ہے، انھوں نے اس کے

متعدد طرق اسناد بیان کیے ہیں، ایک سند میں ہے کہ "انما قیل الحج الاکبر من اجل قول الناس الحج الاصغر (حج اکبر اس لیے کہا گیا ہے کہ لوگ حج اصغر کہتے تھے) اس کے متعلق امام طحاوی فرماتے ہیں کہ یقینی طور پر نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کس کا قول ہے، ممکن ہے زہری کا قول ہو کیونکہ اکثر وہ اپنی بات کو حدیث میں خلط ملط کر دیتے ہیں، جس سے یہ اشتباہ ہو جاتا ہے کہ وہ حدیث ہی کا حصہ ہے، حالانکہ درحقیقت وہ حدیث کا حصہ نہیں ہوتا، اسی لیے امام زہری کو موسیٰ بن عقبہ نے اس سے منع کیا تھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور اپنے کلام میں فصل و تفریق کر دیا کرو۔"[1]

"علمائے اسناد کے نزدیک عطا بن سائب سے روایت کرنے والوں میں چار آدمی شعبہ، ثوری، حماد بن سلمہ اور حماد بن زید حجت ہیں، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو وہ مستند نہیں قرار دیتے، اس کے باوجود ہمام کی روایت کو جو انھوں نے عطا سے بیان کیا ہے ہم نے صرف اس لیے نقل کیا کہ ہمام کا بصرہ میں عطا سے سماع ثابت اور قوی ہے۔ اسلیے کہ ایوب سختیانی جب بصرہ تشریف لائے تو انھوں نے لوگوں سے ان کے پاس جا کر نماز کے بعد تسبیح پڑھے جانے والی حدیث کو دریافت کرنے کیلیے کہا، اس سے ہمام کا وہ سماع قوی ثابت ہوتا ہے جو بصرہ میں ہوا، ان سے اختلاط و التباس اس وقت ہوا جب وہ کوفہ واپس چلے آئے تھے۔"[2]

اسناد کی قوت و صحت کو انھوں نے حدیث کی صحت و عدم صحت کا معیار بنایا ہے، مثلاً

"اس باب کی جملہ حدیثیں دو قسم کی ہیں، ایک میں "فلیعتق رقبۃ" کا حکم ہے اور اس کو صاحب حدیث ابراہیم بن ابی عبلہ سے چار اشخاص مالک، ابن مبارک، یحییٰ بن حمزہ اور ابن عبدالرحمن ہشیم نے روایت کیا ہے، دوسری قسم میں "اعتقوا عنہ رقبۃ" ہے، اس کو ابراہیم سے دو آدمیوں یعنی عبداللہ بن سالم اور ضمرہ بن ربیعہ نے بیان کیا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے

---

[1] مشکل الآثار ج ۲ ص ۱۹۶ و ۱۹۷ [2] ایضاً ج ۱ ص ۵۵ و ۵۶

مقابلہ میں چار آدمیوں کا زیادہ لحاظ کیا جائیگا لیکن یہاں ترجیح کا ایک خاص سبب یہ بھی ہو کہ ان چار آدمیوں میں مالکؒ اور ابن مبارکؒ جیسے بلند پایہ لوگ ہیں جو بڑے حافظ و ثابت سمجھے جاتے ہیں، اور جن کا ضبط و ثقاہت ابن سالم اور ضمرہ کے مقابلہ میں زیادہ مسلّم ہے۔"[1]

ایک راوی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہم کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ابو حذیفہؓ جن سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کون ہیں؟ ایک اور حدیث میں اس کی یہ وضاحت موجود ہے کہ وہ عبد اللہ بن مسعودؓ کے اصحاب تلامذہ میں سے تھے، اس سے ان کی عظمت شان اور علوے مرتبت کا پتہ چلتا ہے، ان کے قبیلہ کے متعلق امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں یہ تصریح کی ہے کہ ان کا نام سلمہ بن صہیب ارحبی تھا اور ارحب قبیلہ ہمدان کی شاخ ہے۔"[2]

لغت وعربیت

مشکل الآثار میں الفاظ و لغات کی تشریح اور لغت و عربیت کے متعلق نہایت محققانہ معلومات ہیں جو عموماً حدیث کی کتابوں میں نہیں ملتے، اس لیے ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے،

امام طحاوی جب الفاظ وغیرہ کی تحقیق کرتے ہیں تو قرآن مجید اور کلام عرب کے استعمالات سے نہایت لطیف بحث کرتے ہیں، مثلاً لفظ "زعموا" کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اس لفظ کو قرآن مجید نے اکثر ایسے مواقع پر استعمال کیا ہے جہاں مذموم لوگوں کی مذموم حرکتوں وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا (تغابن - ۱ع) — منکر دعوی کرتے ہیں کہ وہ ہرگز اٹھائے نہ جائیں گے۔

۱ مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۱، ۲ ایضاً ج ۲ ص ۱۹

اور اس کے بعد فرمایا:-

قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ (تغابن ع ۱) — تو کہہ دے کیوں نہیں! قسم ہے میرے رب کی بے شک تم کو اٹھنا ہے پھر تم کو جتلانا ہے جو کچھ تم نے کیا،

دوسری جگہ فرمایا:-

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بنی اسرائیل - ع ۶) — کہہ دے کہ پکارو جن کو تم سمجھتے ہو سوائے اس کے،

اور اس کے بعد کہا گیا:-

فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا — سو وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کھول دیں تکلیف کو تم سے اور نہ بدل دیں۔

اس قسم کی متعدد آیتیں ثبوت میں نقل کرکے لکھا ہے کہ ان میں مذموم لوگوں کے مذموم اعمال کی خبر دی گئی ہے،[1]

الفاظ کی تشریح و وضاحت

بعض الفاظ و کلمات کا خاص مفہوم مراد ہوتا ہے، اور اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "سباب المسلم فسوق" یعنی مسلمان کو سب و شتم کرنا فسق ہے، امام طحاوی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہاں فسوق کے معنی محمود اور قابل ستائش کام کو چھوڑ کر مذموم کام کی طرف جانا ہے

اس کی نظیریں بہت ہیں، خود کلام پاک میں ہے

ففسق عن امر ربه (الکہف - ع ۷) — سو نکل بھاگا اپنے رب کے حکم سے

جو خروج عن امر ربہ کے مفہوم میں ہے، اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کے اندر جن

۱ مشکل الآثار ج ۱ ص ۶۷

پانچ چیزوں کے قتل کو مباح قرار دیا ہے ان کے لیے فواسق کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں لوگوں کو اذیت دینے کے لیے نکلتی ہیں"۔[۵۱]

اسی حدیث کے دوسرے ٹکڑے "وقتاله کفر" یعنی مسلمان سے قتال کرنا کفر ہے، کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"کفر سے مقصود اللہ کا انکار نہیں جس کی وجہ سے آدمی مرتد ہو جاتا ہے بلکہ یہ تغطیہ (چھپانا، ڈھانکنا) کے مفہوم میں ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ ہے

کمثل غیث اعجب الکفار نباته (حدید ع۳)	جیسے حالت ایک مینہ کی جو خوش لگا کسانوں کو اس کا سبزہ

چنانچہ عام علمائے تاویل کا اتفاق ہے کہ یہاں کفار سے زُرّاع (کاشتکار) مراد ہیں، اس لیے کہ یہ لوگ زمین کے اندر بیج ڈالتے ہیں اور ان کے اس عمل سے وہ چھپ جاتا ہے، حدیث مذکور میں کفر سے کفر باللہ مراد نہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو قتل کرنے کے بعد بھی کافر و مشرک نہیں ہوتا اس لیے عام مسلمانوں کو قتل کرنے کے بعد وہ بدرجۂ اولیٰ کافر نہ ہوگا، اسی طرح کسوف شمس (سورج گرہن) والی حدیث میں ہے کہ آپ نے جہنم کا مشاہدہ فرمایا اور اس میں آپ کو اکثر عورتیں نظر آئیں، صحابہ نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا، یہ ان کے کفر کا نتیجہ ہے، انھوں نے عرض کیا کیا وہ انکار خدا کرتی ہیں، ارشاد ہوا نہیں! بلکہ شوہروں کے احسان کا کفر کرتی ہیں، اگر تم کسی عورت کے ساتھ سو بھلائیاں کرو، لیکن اگر وہ اتفاقاً تمھاری جانب سے ایک بھی ناپسندیدہ کام دیکھے گی تو کہے گی میں نے تمھاری جانب سے کوئی بھلائی کا کام کبھی نہیں دیکھا، پس اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے فعل کو کفر سے اسلیے تعبیر کیا کہ وہ احسان فراموشی کرتی ہیں جس کی ممانعت کی گئی ہے،

اسی قسم کی اور حدیثیں مثال میں بیان کر کے دکھایا ہے کہ کفر سے یہاں کفر باللہ مراد نہیں ہے۔[۵۲]

---

[۵۱] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۶۶ [۵۲] ایضاً ص ۳۶۷ - ۳۶۹

زبان کے استعمالات

اہل عرب کا عام اور معروف قاعدہ ہے کہ وہ جب دو چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو خطاب کے آخر میں ان دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایک ہی چیز سے متعلق وصف اور خصوصیت کو دونوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ	اللہ نے دو دریا چلائے ملکر چلنے والے
لَّا يَبْغِيَانِ (رحمن ع)	ان کے درمیان ایک پردہ ہے۔

اس کے بعد ہے

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ	ان سے موتی اور مونگا نکلتا ہے:

حالانکہ موتی اور مونگے ایک ہی سمندر سے نکلتے تھے لیکن خطاب میں دونوں کا ذکر ہے، اسی طرح دوسری جگہ ہے

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ	اے جنوں اور انسانوں کی جماعت کیا تمھارے
رُسُلٌ مِّنْكُمْ (انعام - ع ۱۶)	پاس تمھارے ہی اندر سے رسول نہیں پہنچے تھے؟

ظاہر ہے کہ خدا کے رسول صرف انسانوں کے اندر سے ہوتے تھے، اور جنات سے نہیں ہوتے تھے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں فرمایا کہ

تبایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ	مجھ سے بیعت کرو کہ تم لوگ کسی چیز کو خدا کا شریک
شیئا۔۔۔۔ فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ	نہ بناؤ گے۔۔۔ جن لوگوں نے اس بیعت کے مطابق ٹھیک
ومن اصاب شیئا فعوقب علیہ فھو	عمل کر کے عہد پورا کیا ان کا بدلہ اللہ کے ذمہ ہے اور جس نے
کفارۃ لہ ومن اصاب من ذلک شیئا	عہد شکنی کی اور اسکو سزا دیگئی تو یہ اسکے لیے کفارہ ہوگی
فسترہ اللہ علیہ فامرہ الی اللہ	اور جس کی عہد شکنی کی اللہ نے پردہ پوشی کی اسکا معاملہ
ان شاء عذبہ وان شاء غفر لہ	اسی کے ذمہ رہیگا اگر وہ چاہے تو عذاب دے اور چاہے معاف کر دے

حالانکہ یہ معلوم ہے کہ اگر کسی شخص نے خدا کا شریک بنایا اور اسکو اسکے شرک کی سزا دیگئی تو یہ سزا

اس کے لیے کفارہ نہیں بن سکتی اس لیے کہ اللہ کا عام فیصلہ یہ ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ — بیشک اللہ نہیں بخشتا ہے اسکو جو اسکا شریک کرے کسی کو
مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (نساء ۔ ع ۱۸) — اور بخشتا ہے اس کے سوا جس کو چاہے،

ایسی صورت میں اس حدیث کا یہ ٹکڑا کہ "من اصاب من ذالک شیئا" الخ اس کے جملہ امور سے جو بیعت میں مذکور ہیں، تعلق نہیں کیا جائیگا، بلکہ چند ہی کیجانب کیا جائیگا۔"[1]

ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے اہل مدینہ کے بارہ میں فرمایا (اللھم بارک لھم فی مکیالھم و بارک لھم فی صاعھم و فی مدھم) یعنی اے اللہ تو ان کے ناپ تول میں برکت دے، ظاہر ہے کہ کیال، صاع اور مد میں برکت سے مقصود دراصل ان پھلوں میں برکت ہے جو مدینہ والوں کے مال تھے اور جن پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا، یہ کلام عرب کا عام استعمال ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ — اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے اور اس
الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا (یوسف ۔ ع) — قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں۔

یہاں قریہ (بستی) اور عیر (قافلہ) سے اہل قریہ اور اہل عیر مراد ہیں، اسی طرح آپ نے کمیال وغیرہ کا ذکر اسلیے کیا ہے کہ وہ دراصل پھلوں کے ناپ تول کے پیمانے تھے۔[2]

اہل عرب اختصار کی وجہ سے اکثر کلام میں حذف سے کام لیتے ہیں جس کو مخاطب موقع و محل سے سمجھ لیتا ہے، حذف الفاظ اور جملوں دونوں میں ہوتا ہے، مثلاً کفی بالسیف شا یعنی تلوار شہادت کیلئے کافی ہے، یہاں شاہد کے لفظ کو مختصر کر کے صرف شا کہا گیا ہے، اسی طرح کلام مجید میں ہے:

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ — اور اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا کہ اس سے پہاڑ چلنے یا زمین
بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ (رعد ۔ ع) — ٹکڑے ہو جاتی یا اس سے مردے بول پڑتے،

اس کے بعد بقیہ کلام حذف ہے، اسی طرح فرمایا:

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۴۲، ۴۳، [2] ایضاً ج ۲ ص ۹۸

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ (نور ع) — اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تمہارے اوپر اور اسکی رحمت اور یہ کہ اللہ متوجہ ہونے والا اور حکمت والا ہے

یہاں اللہ کے فضل و رحمت کے نتیجہ میں جو کچھ ہوا اس کو حذف کر دیا گیا۔"[1]

کنایہ: زبان کے استعمالات میں کنایہ سے بھی کام لیا جاتا ہے، امام طحاوی ایک حدیث میں "دخل فی الصلوٰۃ" یعنی آپ نماز میں داخل ہوئے کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اسکے معنی قرب دخول کے ہیں حقیقۃً دخول مراد نہیں ہے اور یہ زبان کا معروف استعمال ہے قرآن مجید میں ہے:-

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ (بقرہ ۔ ع ۳۰) — اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو

یہاں بلوغ اجل کا قرب مراد ہے نہ کہ حقیقی بلوغ اجل، کیونکہ یہ معنی مراد لینے میں متعدد اشکالات پیدا ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ مسلمان حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جنکے ذبح کرنے کا خدا نے حکم دیا تھا، ذبیح کہتے ہیں، حالانکہ وہ ذبح نہیں کیے گئے تھے بلکہ قریب تھا کہ ذبح کر دیے جاتے۔[2]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

ایک حدیث میں ہے کہ ان رسول اللہ قاء فافطر یعنی قے کی وجہ سے آپ کا روزہ جاتا رہا حالانکہ علمائے امت کا عام مسلک یہ نہیں ہے بلکہ انکا اعتماد دوسری روایت پر ہے (ان من ذرعہ القیئ لم یکن مفطرا) یعنی اگر کسی شخص کو دفعۃً بغیر قصد و ارادہ کے قے ہو گئی تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹیگا، یہ دونوں روایتیں نہ تو باہم مختلف ہیں اور نہ ان سے کوئی خاص وہم و اشکال پیدا ہوتا ہے، اسلیے کہ یہ عربی زبان کا کلام ہے اور اس میں مخاطب کے فہم کی رعایت سے اکثر کنایات کا استعمال ہوتا ہے، اس صورت کو مد نظر رکھنے کے بعد قاء، فافطر، قاء، فضعف فافطر کے معنی میں ہوگا، قرآن مجید میں ہے: ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ (مائدہ ع ۱۲) یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب قسم کھا بیٹھو) جو دراصل ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ فَحَنِثْتُمْ یعنی یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم کھا بیٹھو اور حانث ہو جاؤ، کیونکہ عام اتفاق ہے کہ محض قسم کھانے اور حانث نہ ہونے سے کفارہ لازم نہیں ہوتا بلکہ حانث ہونے کے بعد ہی وہ لازم ہوگا۔"[3]

[1] مشکل الآثار ج ۴ ص ۲۱۲-۲۱۳ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۹-۲۶۰ [3] ایضاً ج ۲ ص ۲۶۹-۲۷۵

مثل | کلام بطور مثل بھی ہوتا ہے، مثلاً لوان العلم بالثریا لنالہ رجال من فارس یعنی اگر علم ثریا پر بھی ہو تو بعض اہل ایران اس کو حاصل کرلیں گے، بعض روایتوں میں لوان الدین بالثریا، یعنی اگر دین ثریا پر بھی ہو، ہے اسکے متعلق لکھتے ہیں: "یہ بطور مثل ہے جس طرح ایک آدمی دوسرے سے کہتا ہے کہ انت منی کالثریا (تم مجھ سے ثریا کے مانند (دور) ہو) اور اس کا مقصد بُعد اور دوری ظاہر کرنا ہے، جس طرح قرب کے اظہار کیلئے کہا جاتا ہے انت منی موخر القلب (تم مجھ سے قلب کی طرح (قریب) ہو) یا انت منی نصب عینی (تم میری نگاہوں کے سامنے ہو) یا انت منی کذراعی من عضدی[1] (تمھارا اور میرا حال کلائی اور بازو کی طرح ہے)

لغوی تحقیقات میں انھوں نے علمائے لغت کے اقوال و اختلافات بھی ذکر کیے ہیں۔

نحوی مسائل | لغت و عربیت کی طرح وہ نحوی مسائل پر بھی بحث کرتے ہیں، مثلاً ایک حدیث کے سلسلہ میں آیت کریمہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (انبیاءع) (تم اور جنکو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو دوزخ کے ایندھن ہیں) میں "ما" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: "ما غیر بنی آدم کے لیے اور من بنی آدم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ (انبیاءع) اور جو کوئی ان میں سے کہے کہ میں معبود ہوں اللہ کے سوا

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا (فرقان ع) اور جو کوئی کرے یہ کام وہ جا پڑا گناہ میں

یہ اور اس طرح کے دوسرے مواقع پر "من" بنی آدم کیلیے استعمال ہوا ہے اور غیر بنی آدم کیلیے "ما" آتا ہے، جیسے

وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (مائدہ ع) (اور حرام ہے) جس کو درندہ نے کھالیا ہو مگر جس کو تم نے ذبح کرلیا ہو (وہ حلال ہے) اور جو ذبح ہوا کسی تھان پر (وہ بھی حرام ہے)

لیکن اس عام قاعدہ اور مالوف طریقہ کے خلاف بھی مثالیں ملتی ہیں اور اہل عرب کبھی "ما" کو بھی بنی آدم کیلیے "من" کی جگہ استعمال کرتے ہیں، گو یہ استعمال "من" کی طرح عام اور زیادہ نہیں ہے، تاہم اسکی بعض مثالیں موجود ہیں، جیسے

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (نساءع) اور خاندان والی عورتیں (حرام ہیں) مگر جنکے مالک ہوجائیں تمھارے ہاتھ۔

---

[1] مشکل الآثار ج ۳ ص ۹۶

یہاں "الا ما ملکت" "الا من ملکت" کی جگہ لایا گیا ہے، اسی طرح درج ذیل آیات میں بھی "ما" "من" کی جگہ آیا ہے:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (حدید ع) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (جمعہ ع) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ[1] (بلد ع) اور قسم ہے جننے والے کی اور جو اس نے جنا۔

مشہور حدیث کل عمل ابن آدم ھولہ الا الصوم کے سلسلہ میں الا کے اتصال و انقطاع کی بحث کرتے ہوئے لکھتے: "یہ استثناء لکن کے مفہوم میں ہے، کیونکہ الا کبھی کبھی لکن کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے، اور اس صورت میں اس کا وہ مفہوم نہیں ہوتا جو استثناء والے الا کا ہوتا ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے:-

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ سو تو سمجھائے جا تیرا کام تو یہی سمجھانا ہے، تو ان پر داروغہ نہیں ہے جس نے منہ موڑا اور منکر ہوگیا تو اللہ اس پر بڑا عذاب کریگا۔

یہاں استثناء مقصود نہیں ہے بلکہ یہ در اصل لکن من تولی وکفر کے مقام پر آیا ہے، اسکی وہ علامت فارقہ جس سے دونوں مفہوموں کا اختلاف معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ اگر الا کے بعد جو چیز بیان کیگئی ہو اسکی خبر آئے تو وہ لکن کے مفہوم میں ہوگا جیسا کہ اس آیت میں ہے لیکن خبر مذکور نہ ہو تو الا استثناء کیلیے ہوگا، مثلاً

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ[2] (عصر ع) زمانہ شاہد ہے کہ انسان بیشک ٹوٹے میں ہے مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور انھوں نے بھلائیاں کیں۔

تمثیل | تمثیل و تشبیہ کی بھی جا بجا وضاحت ہے، مثلاً حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ "وفیکم مثلہ" یعنی تمھارے اندر (مسلمانوں میں) بھی ذوالقرنین کی طرح کے لوگ ہیں، طحاوی لکھتے ہیں:-

"یہ تمثیل و تشبیہ صرف دعوت الی اللہ اور قیام بالحق کے اعتبار سے ہے، کیونکہ ایک چیز کو دوسری چیز کے مشابہ قرار دینے کے لیے مکمل مشابہت اور اشتراک ضروری نہیں ہے، صرف ایک معنی اور وصف میں مماثلت بھی کافی ہے، جیسے

---

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۳۳-۳۴۴ [2] ایضاً ج ۴ ص ۱۱۶ و ۱۱۷

اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (طلاق ۔ ع ۲) — اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین بھی اتنی ہی۔

ظاہر ہے کہ آسمان کے مثل زمین کو صرف اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ ان کی تعداد بھی سات ہے یعنی صرف عدد میں اشتراک اور یکسانی کی وجہ سے زمین کو آسمان کے مثل کہا گیا ہے ورنہ دونوں کی عام نوعیتیں بہت مختلف اور جدا جدا ہیں۔" (مشکل الآثار ج ۲ ص ۳۵۱)

ایک حدیث یغسل الاناء من الھرۃ کما یغسل من الکلب یعنی بلی کا جوٹھا برتن بھی کتے کے جوٹھے برتن کی طرح دھویا جائیگا۔ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہاں کما کی تشبیہ صرف اس معنی میں ہے کہ کتا اور بلی دونوں کی وجہ سے برتن دھویا جائیگا، لیکن دونوں کی وجہ سے برتن دھوئے جانے کی تعداد جدا جدا ہے، لیکن چونکہ دھوئے جانے کا وصف دونوں میں مشترک ہے، اس لیے کما لایا گیا ہے، یہ عربی زبان کا ایک اسلوب ہے، کلام عرب میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، مثلاً

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (انعام ۔ ع ۴) — نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین میں اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو بازوؤں سے مگر ہر ایک تمھاری ہی طرح امت ہے،

یہاں چوپایوں اور چڑیوں کو انسانوں کے مثل و مشابہ اس لیے نہیں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی عام نوعیت اور خلقت وغیرہ کے اعتبار سے انسانوں کے مشابہ ہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں بھی انسان ہی کی طرح خدا کی عبادت و اطاعت کی آزمایش میں ڈالی گئی ہیں، اور اس اعتبار سے ان کی انسانوں سے مماثلت ہے، پس حدیث زیر بحث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بلی کا جوٹھا بھی کتے کے جوٹھے کی طرح سات مرتبہ دھویا جائیگا۔" (ایضاً)

مصنف کا ایک اور بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس میں جو گوناگوں امور و مباحث بیان

کیے ہیں، ان کے متعلق ماہرین اور ائمہ فن کے خیالات بھی تحریر کیے ہیں، اور اس سلسلہ میں اہم کتابوں کے حوالے دیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر احادیث کے علاوہ مختلف فنون پر بھی تھی،

افسوس ہے کہ یہ اہم اور بلند پایہ کتاب ابھی تک مکمل زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے صرف اسکی ۴ جلدیں شائع کی ہیں جو تقریباً ۱۹۳۰ صفحات پر مشتمل ہیں، ہر جلد کے آخر میں فہرست مضامین ہے جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۰ ہے چوتھی جلد کے آخر میں ایک تقریظ ہے، مرتبین نے مختصر مگر مفید حواشی بھی تحریر کیے ہیں، جو الفاظ و لغات کی تشریح، اور اسماء و رواۃ کے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں، اصل متن میں جو مختصر حدیثیں ہیں ان کو حاشیہ میں مکمل اور مفصل درج کیا گیا ہے، الفاظ کی تشریح میں مجمع بحار الانوار اور اسماء و اعلام کے لیے تہذیب التہذیب اور نقل احادیث میں شرح معانی الآثار اور دوسری مستند کتابوں کو ماخذ بنایا گیا ہے،

محدث ابو الولید بن رشد مالکی نے اس کا مختصر تحریر کیا ہے، اس میں امام طحاوی پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، اس کا مختصر قاضی القضاۃ جمال الدین یوسف ابن موسیٰ ملطی نے المعتصر من المختصر کے نام سے کیا ہے، یہ دائرۃ المعارف سے سنہ ۱۳۱۷ھ میں لمبی تقطیع کے ۴۷۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، صاحب کتاب نے شروع میں لکھا ہے:۔

"مشکل الآثار بڑی اہم کتاب اور گوناگوں فوائد و لطائف پر مشتمل ہے لیکن وہ غیر مرتب و غیر منظم ہے، ایک باب کی حدیثیں ایک جگہ کے بجائے متفرق اور منتشر طور پر پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں، ایسی صورت میں طلبہ اور اہل علم کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ کیے بغیر اس سے استفادہ مشکل اور دشوار تھا، اس لیے مجھکو اس کے گوناگوں فوائد کے خیال سے اس کی ترتیب اور جمع کا خیال ہوا، لیکن اپنی بے بضاعتی کے سبب اس اہم کام کو شروع کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، حسن اتفاق سے مجھکو ابو الولید باجی کا مختصر دستیاب ہوا، انھوں نے بڑے عمدہ اور مناسب طریقہ پر مشکل الآثار

مختصر کیا تھا، ہر باب کی حدیثیں یکجا کر دی تھیں، ترتیب میں حسن و موزونیت کا اچھی طرح لحاظ رکھا تھا، حدیثوں کی سندیں اور طرق حذف کر دی تھیں، اکثر الفاظ اس طور پر مختصر کیے تھے کہ معنی میں خلل بھی نہ ہو اور لوگوں کو اس کے سمجھنے میں دقت بھی پیش نہ آئے، مجھے اس کتاب کے ملنے پر بڑی خوشی ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا اور اس کا خلاصہ اور مغز لے لیا، الفاظ وغیرہ جوں کے توں نہیں نقل کیے ہیں، کم سے کم الفاظ میں معانی و مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے، کتاب کی ترتیب اس طور پر ہے کہ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں اور اوصاف و خصوصیات کی حدیثیں ہیں، پھر آپ کے معجزات اور سن وفات سے متعلق روایات ہیں، اس کے بعد احکام و شرائع کے ابواب جدا جدا عنوانات کے تحت ہیں، پھر تفسیر قرآن اور اسباب نزول وغیرہ کے ابواب مختصر کی ترتیب کے مطابق ہیں، باجی کے اعتراضات و استدراکات بھی نقل کر کے میں نے بعض کے جوابات دیے ہیں، پورے مجموعہ میں ۹۳۳ حدیثیں ہیں، ان کے علاوہ ایسی بھی حدیثیں ہیں جو مصنف نے اپنی بحث و تحقیق کے سلسلہ میں بطور ثبوت و استشہاد بیان کیے ہیں[1]۔"

صاحب معتصر نے طویل سندیں حذف کر دی ہیں، مصنف نے جو متعدد طرق و اسناد بیان کیے ہیں، ان میں صرف وہی نقل کی ہیں جن میں بین طور پر اختلاف پایا جاتا ہے، وہ مختلف روایتوں کے صرف اس حصہ کا ذکر کیا ہے جس سے ان کے اصل مدلول اور روایت کا خاص فرق و تضاد ظاہر ہوتا ہے، مصنف نے روایت کے متعلق جو شبہات تحریر کیے ہیں اور پھر ان کی جو توجیہ بیان کی ہے صاحب معتصر نے اس کو نہایت مختصر کر کے اس طرح نقل کیا ہے کہ مفہوم باسانی سمجھ میں آجائے۔

---

[1] المعتصر من المختصر من مشکل الآثار ص ۳

جاہلی شاعری میں زہدیہ رجحانات

از

جناب حافظ غلام مصطفےٰ صاحب ایم اے استاد شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جاہلی شاعری عربی ادب کا قدیم ترین سرمایہ ہے، جو آج ہمارے پاس موجود ہے، ظہور اسلام سے قبل کا زمانہ اسلامی اصطلاح میں عہدِ جاہلیت کہلاتا ہے، اس لیے اس زمانہ کی شاعری کو جاہلی شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ کل سرمایہ پانچویں صدی اور زیادہ تر چھٹی صدی عیسوی کے عرب شعرا کی طرف منسوب ہے، جو زبانی روایت کے ذریعہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہا، تاآنکہ آٹھویں اور نویں صدی میں اس کو ضبط تحریر میں لایا گیا، یہی اشعار عربی ادب کے ابتدائی نقوش ہیں، لیکن درحقیقت یہ عربی شاعری کے عہدِ طفولیت کے خد و خال نہیں ہیں، بلکہ اس کے شباب کی توانائیاں ہیں، جب اہل نظر اس کے بانکپن کو دیکھتے ہیں تو حیران و ششدر ہو کر سوچ میں پڑ جاتے ہیں، ان کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ نکھار صدیوں کی مشق و محنت اور تراش و خراش کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن یہ سب کچھ کب اور کیسے ہوا، اس کا صحیح علم آج کسی کو نہیں ہے، بہرحال جاہلی شاعری کا مرتبہ فصاحت و بلاغت، شوکت و سطوت، جمال و جلال، سادگی و پرکاری اور دوسری فنی خصوصیات کے لحاظ سے بہت بلند اور بڑی حد تک مکمل اور معیاری ہے[1]، یہی وجہ ہے کہ عباسی دور کی چند بے باک ہستیوں کے سوا کسی نے آج تک اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کی، اور ہر زمانہ میں اس کے حسن و جمال اور فضل و کمال

---

[1] جاہلی شاعری کی خصوصیات کیلئے دیکھیے: تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، تالیف جرجی زیدان، الجزء الاول، قاہرہ ۱۹۵۷ء ص ۵۰ و ما بعد

کا اعتراف کیا گیا ہے، اور آج بھی اس کی عظمت و برتری اپنی جگہ مسلم اور ناقابل انکار ہے،

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر قوم کا ادب اس کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، اگر زندگی مطمئن و پرسکون ہوتی ہے تو ادب میں بھی سکون و اطمینان کی جلوہ گری ہوتی ہے، اور اگر زندگی میں ہیجان و اضطراب ہوتا ہے تو ادب کی لہریں بھی متلاطم نظر آتی ہیں، جاہلی شاعری بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، چنانچہ وہ صحیح معنی میں عربوں کی حقیقی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں بدوی زندگی کی روح جیتی پھرتی نظر آتی ہے۔

صحرائی زندگی میں عموماً سادگی، سچائی، بے تکلفی اور بے باکی کے جوہر ہوتے ہیں، عرب فطری طور پر حریت پسند، دلیر، متکبر اور جفاکش ہوتا ہے، اس کے احساس میں شدت، مزاج میں تیزی، حوصلہ میں بلندی، طبیعت میں جوش، دل میں امنگ اور جذبہ میں اشتعال ہوتا ہے، وہ عموماً ضعف و عجز، تواضع و خاکساری اور بزدلی و پست ہمتی سے نفرت کرتا ہے، لڑائی میں ثابت قدم اور مصیبت میں صابر ہوتا ہے، فخر و حماسہ، کبر و نخوت، غیظ و غضب، عصبیت و بربریت اور جرأت و انتقام کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے[1]، یہی صفات جاہلی شاعری کے نمایاں خصوصیات ہیں، جن کے ذیل میں عرب شعرا نے زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے کمال دکھائے ہیں،

ایسی صورت میں جاہلی شاعری کے اندر زہد کے رجحانات کو تلاش کرنا بظاہر بے سود معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ایک زاہد کی طبیعت عجز و مسکنت، ضعف و انکسار، فقر و فاقہ، قناعت و استغنا اور غمگینی و افسردگی کی طرف مائل ہوتی ہے، وہ درد و غم، حزن و ملال، حوادث روزگار اور موت و فنا کے تصور میں محو ہوتا ہے، دنیا اور اس کی آرائش و زیبائش اور دنیوی مال و متاع سب اسکی نظر میں ہیچ اور بے وقعت ہوتے ہیں، اور ان صفات کو بدوی زندگی سے بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی،

[1] عربی اخلاق و عادات کے لیے دیکھئے: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، تالیف الشیخ محمد الخضری بک، قاہرہ ۱۳۰۶ھ، ص ۹۳ تا ۱۴۴

یہی وجہ ہے کہ جاہلی شاعری کے اہم اور معروف موضوعات میں زہد کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے، اسکے باوجود جب ہم جاہلی قصائد پر نظر ڈالتے ہیں تو جابجا ایسے اشعار ملتے ہیں جو زہدیہ کلام سے بڑی حد تک مشابہ ہیں۔

کسی بڑے ملک کے تمام افراد ہر لحاظ سے ایک ہی سطح پر نہیں ہوتے بلکہ طبیعت، مزاج، احساس اور فکر کے اعتبار اور تمدنی، اقتصادی اور ثقافتی حالتوں کے لحاظ سے ان میں بہت فرق ہوتا ہے، ظہور اسلام سے قبل عربوں میں بھی یہ فرق بہت نمایاں تھا، ایک طرف ریگستانی علاقوں میں بدوی قبائل صحرائی زندگی گذار رہے تھے، تو دوسری طرف یمن کے شاداب علاقہ کے علاوہ خود قلب عرب میں مکہ، طائف، یثرب، اور خیبر جیسی بستیاں بھی تھیں، جہاں کے باشندے حضری یا کم از کم نیم حضری ضرور تھے، ان میں سے بعض بستیاں بہت اہم تجارتی منڈیاں بھی تھیں، وہ تجارتی قافلوں کے راستہ پر آباد اور مختلف ممالک کے درمیان اتصال کی نہایت اہم کڑیاں تھیں، اس لیے یہاں کے باشندے قدرتی طور پر مختلف بیرونی اقوام کی تہذیب و تمدن سے متاثر تھے اور ان کی ذہنی و فکری سطح بھی صحرائی بدوؤں کی بہ نسبت بلند تھی۔

اس کے علاوہ عرب کی شمالی سرحد پر دو عرب حکومتیں[1] قائم تھیں، دریائے فرات کے ساحل پر حیرہ کی حکومت تھی، جہاں لخمی خاندان کے عرب ایرانی بادشاہوں کی سرپرستی میں حکومت کرتے تھے، اس کے مغرب میں غسانی عربوں کی حکومت تھی جو رومیوں کے زیر سایہ تھی، ان عرب حکومتوں پر ایرانی، رومی اور یونانی ثقافت کا رنگ غالب تھا جو صرف ان ہی علاقوں تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے اثرات اندرون ملک تک پہنچتے تھے، کیونکہ عربوں کی آمد و رفت ان حکومتوں کے درباروں اور ان کے علاقوں میں برابر ہوتی رہتی تھی۔

[1] ان دونوں حکومتوں کے متعلق دیکھئے: محاضرات فی تاریخ العرب، تالیف الدکتور صالح احمد العلی، بغداد ۱۹۵۹ء، ج ا، ص ۵۰ تا ۸۰

مذہبی[1] عقائد کے لحاظ سے بھی جاہلی عربوں میں یکسانیت نہیں تھی، ریگستانی بدؤں کا یا تو کوئی مذہب نہیں تھا یا بت پرست تھے، بستیوں میں رہنے والے نیم حضری عرب عام طور پر ملت ابراہیمی کے قائل تھے، اور ان میں شریعت ابراہیمی کی کچھ باقیات رائج بھی تھیں، لیکن ان میں بھی شرک وبت پرستی کا رواج عام تھا، اس کے علاوہ یثرب اور خیبر وغیرہ میں یہودی بھی بہت قدیم زمانے سے آباد تھے، جن کے اثر سے ہمسایہ عربوں کے کچھ افراد یہودی ہو گئے تھے، اور اکثر لوگ یہودیوں کے عام مذہبی عقائد و رسوم سے واقف تھے، شمال میں عیسائیت کا اثر غالب تھا، اس کے اطراف وجوانب کے متعدد عرب قبیلے عیسائی ہو گئے تھے، یا کم از کم عیسائیت کی طرف مائل تھے،

اسی طرح جب ہم جاہلی شعراء کی زندگیوں[2] پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی بین فرق دکھائی دیتا ہے، کچھ شعراء نے خالص بدوی زندگی بسر کی اور ہمیشہ صحرا نوردی، غارتگری اور طلب انتقام میں مشغول رہے، اس کے برعکس بعض شعراء نے عرب کی بستیوں، بازاروں اور میلوں میں نظر آتے ہیں، بلکہ ان کے تعلقات حیرہ اور غسان کے بادشاہوں سے بھی پائے جاتے ہیں، وہ ان کے درباروں میں جاتے ہیں اور انکو اپنے اشعار سناتے ہیں، اور انعام واکرام سے نوازے جاتے ہیں،

ظاہر ہے کہ یہ شعراء عجمی افکار وخیالات سے بھی متعارف ہوں گے، جیسا کہ ان کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے، ان کے علاوہ کچھ شعراء یہودی اور عیسائی بھی تھے، اگرچہ ان کی تعداد کم ہے اور انکا شعری سرمایہ بھی بہت قلیل مقدار میں پایا جاتا ہے، لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا،

اسی طرح جاہلی شعراء تمدنی، ثقافتی، ذہنی، فکری اور مذہبی اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی دور تھے، چنانچہ ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات اگرچہ بڑی حد تک یکساں ہیں لیکن تفصیلی

---

[1] ادیان عرب کے لیے دیکھیے: تاریخ العرب قبل الاسلام، تالیف الدکتور جواد علی، الجزء الخامس، المجمع العلمی العراقی ۱۹۵۵ء

[2] جاہلی شعراء کے حالات کے لیے دیکھیے: تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، تالیف جرجی زیدان الجزء الاول ص ۱۰۵ وما بعد

بیانات کے درمیان جابجا ایسے معانی ومطالب اور افکار وخیالات ملتے ہیں جو تمام شعراء کے کلام میں یکساں طور پر نہیں پائے جاتے،

یہی حال زہدیہ مضامین کا بھی ہے، اگرچہ زہد ان کی شاعری کا مستقل موضوع نہیں تھا، تاہم بعض شعراء کے کلام میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں دنیا سے بے رغبتی، مال ومتاع کی بے وقعتی، زندگی کی بے ثباتی، موت کی ہولناکی، زمانہ کا جبر، تقدیر کا قہر اور گذشتہ اقوام کی تباہی وبربادی کا ذکر کہیں اختصار اور کہیں تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے،

یہ مضامین بعض بت پرست اور بدوی شعراء کے قصائد میں بھی ملتے ہیں، حالانکہ وہ حیات بعد الممات کے قائل نہیں تھے، البتہ اسلام سے قبل بعض ایسی رسموں کے وجود کا پتہ چلتا ہے جن کی روشنی میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض بدوی عرب غالباً موت کے بعد ایک مبہم قسم کی زندگی کا تصور رکھتے تھے، مثلاً بعض قبائل میں "بلیہ" کے نام سے ایک رسم رائج تھی، "بلیہ" اس[1] اونٹنی کو کہتے تھے جو قبر پر باندھ دیجاتی تھی اور اسکو کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں دیجاتی تھی، یہانتک کہ وہ اسی جگہ مرجاتی تھی، اس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اونٹنی آیندہ زندگی میں مرنے والے کے لیے سواری کا کام دے گی، اسی طرح "ہامہ[2]" کا تصور ملتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد انسان کے دماغ سے ایک پرندہ نکلتا ہے، جو اسکی قبر کے گرد اڑتا رہتا ہے، اس پرندہ کو وہ "ہامہ" کہتے تھے، بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور صرف ان مقتولین کے ساتھ مخصوص تھا جن کا انتقام ان کے قاتلین سے نہیں لیا جاتا تھا، چنانچہ انکے خیال کے مطابق ایسے مقتول کا "ہامہ" ہر وقت "اسقونی"، "اسقونی" چلاتا رہتا تھا، یعنی مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ میرا انتقام لو، اور قاتل کے خون سے مجھے سیراب کرو۔

ان تصورات کے پیش نظر صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ بدوی عربوں کے ذہن میں حیات بعد الممات کا ایک دھندلا سا خاکہ تھا جس کے نقوش واضح نہیں تھے، مگر اس کے ساتھ جزا وسزا یا جنت وجہنم

---

[1] بلوغ الادب، تالیف آلوسی مصر ۱۹۲۴ء ج ۲ ص ۳۰۷، [2] ایضاً ص ۳۱۱

کا کوئی تصور نہیں تھا، اس لیے ان کے یہاں خوفِ آخرت کا کوئی سوال نہ تھا، اسلیے ان کے قصائد میں جو زہد یا زہد کے مشابہ خیالات پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا سبب خوفِ آخرت نہیں تھا، اور نہ اس کا مقصد تحصیلِ اجر و ثواب یا اصلاحِ نفس تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ زہد کا تعلق ایک حیثیت سے خود انسان کی فطرت سے بھی ہے جس طرح دولتمندوں اور عیش پرستوں کی دلفریب زندگی کو دیکھ کر مال و متاع کی محبت اور طمع دل میں پیدا ہوتی ہے، اسی طرح زندگی کے انقلابات اور زمانہ کے حوادث کو دیکھ کر دنیوی زخارف کی بے ثباتی اور مال و دولت کی بے وقعتی کا نقش بھی خود بخود دل و دماغ پر کھنچ جاتا ہے، انسان کتنا ہی مالدار، خوشحال صحت مند اور با اقتدار ہو کبھی نہ کبھی زندگی کے انجام کا خیال اسکے دل میں آتا ہی ہے، اسوقت موت کو یاد کر کے وہ غمگین ہوتا ہے، خواہ یہ تاثر چند لمحات ہی کے لیے کیوں نہ ہو بلکہ جو شخص دنیا میں جتنا زیادہ خوشحال ہوتا ہے، موت کے تصور سے اس کو اتنا ہی زیادہ غم ہوتا ہے، اس کے علاوہ بعض انسان فطری طور پر خاموش، قانع، خلوت پسند، منکسر مزاج، افسردہ دل اور غمگین طبع ہوتے ہیں، اور بعض کچھ حوادث کو دیکھکر یا ان میں خود مبتلا ہو کر ان صفات سے متصف ہو جاتے ہیں،

غرض زہدیہ رجحانات کے محرکات متعدد ہو سکتے ہیں، اسلیے بدوی شعراء کے کلام میں جو زہدیہ خیالات پائے جاتے ہیں، ان کے وجوہ و اسباب اور مقاصد و اغراض مختلف مواقع پر مختلف ہیں، کبھی شاعر مال و متاع کی ناپائداری اور زندگی کی بے ثباتی کا ذکر اصحابِ ثروت کو سخاوت و فیاضی کی ترغیب دینے کے لیے کرتا ہے، کبھی طلبِ شہرت و نیکنامی پر ابھارنے کیلئے ان باتوں کا بیان کرتا ہے کہ مال ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے، اور اگر باقی بھی رہا تو زندگی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ مال خرچ اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کر کے نیکنامی حاصل کرنی چاہیے جو ہمیشہ باقی رہیگی۔

اسی طرح شاعر کبھی موت و فنا کا ذکر کر کے جرأت و شجاعت کی ترغیب دیتا ہے کہ جب موت کا

وقت مقرر ہے اور اس سے کسی طرح نجات ممکن نہیں ہے تو میدانِ جنگ سے فرار بے سود ہے، اگر زندگی کی آخری ساعت آگئی ہے تو جائے امن میں بھی موت آسکتی ہے، اور اگر اس کا وقت ابھی نہیں آیا تو انسان حالتِ جنگ میں بھی موت سے محفوظ رہ سکتا ہے، پھر کیوں نہ وہ شجاعت کے جوہر دکھا کر عزت و نیکنامی حاصل کرے اور کیوں بزدل بنکر ذلت و بدنامی کا داغ سہے،

اس کے علاوہ جاہلی شاعر جب کسی حادثہ سے دوچار ہوتا ہے تو کبھی اپنے نفس کو تسلی دینے کے لیے بھی حوادثِ روزگار اور مصائبِ زمانہ کا بیان کرتا ہے، کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ دوسروں کے مصائب کے ذکر سے خود اپنا غم ہلکا ہوتا ہے اور طبیعت کو تسکین حاصل ہوتی ہے،

اسی قسم کے مختلف اغراض و مقاصد ہیں جن کے ذیل میں بدوی شعرا نے اپنے قصائد میں زہدیہ خیالات کا اظہار کیا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو زہد و قناعت کے بالکل متضاد امور یعنی لذت پرستی اور عیش کوشی کے ذکر کے درمیان زندگی کی بے ثباتی اور موت کی قاہری کا بیان ایسے موثر انداز سے کرنے لگتے ہیں کہ اگر سیاق و سباق سے صرف نظر کر کے ایسے اشعار کو پڑھا جائے تو بڑی شدت کے ساتھ زہدیہ جذبات دل کی گہرائی میں موجزن ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں قبیلہ بنو بکر کے مشہور جواں مرگ شاعر طرفہ بن العبد کا ذکر مثال کے طور پر کیا جا سکتا ہے جس کا شمار اصحابِ معلقات میں ہے، طرفہ ایک عیش پرست، رند مشرب، بادہ خوار اور آزاد منش انسان تھا، اس نے اپنے اشعار میں بھی لہو و لعب، عیش و تنعم اور رندی و مے نوشی کی بڑی تلقین کی ہے، چنانچہ اپنے مشہور معلقہ میں شعری روایت کے مطابق پہلے اس نے تشبیب اور اپنی ناقہ کی تفصیل بیان کی ہے، اس کے بعد جہاں اس نے اپنی عیش پرستی، لذت طلبی اور بادہ نوشی کا ذکر بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے وہیں زمانہ کی نیرنگی، عیش و نشاط کی بے ثباتی اور موت کی بے رحمی کا نقشہ بھی بڑے دلگداز انداز میں کھینچا ہے، اس مقام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

أرى الموت أعداد النفوس ولا أرى — بعيداً غداً ما أقرب اليوم من غد

أرى العيش كنزاً ناقصاً كل ليلة — وما تنقص الأيام والدهر ينفد

لعمرك إن الموت ما أخطأ الفتى — لكالطول المرخى وثنياه باليد

متى ما يشأ يوماً يقده لحتفه — ومن يك في حبل المنية ينقد

(میں دیکھتا ہوں کہ موت ایک گھاٹ ہے جس سے اترنا ہے اور کل کو میں دور نہیں سمجھتا، آج میرے نزدیک کل سے بہت قریب ہے، میں سمجھتا ہوں کہ زندگی ایک خزانہ ہے جس میں ہر وقت کمی ہو رہی ہے اور زمانہ جس کو کم کرتا ہے وہ ایک دن ضرور ختم ہو جائیگا، تیری عمر کی قسم! موت کا تیر کسی انسان سے خطا نہیں کرتا، اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے گردن میں رسی باندھ کر چھوڑ دیا گیا ہو، لیکن رسی کے دونوں سرے ہاتھ میں ہوں، جب بھی چاہے اسے ہلاکت کی طرف کھینچ لے اور جو موت کی رسی میں بندھا ہوا ہے وہ لامحالہ کھنچ آئے گا۔)

أرى الموت لا يرعى على ذي جلالة — وإن كان في الدنيا عزيزاً بمقعد

لعمرك ما أدري وإني لواجل — أفي اليوم إقدام المنية أم غد

فإن تك خلفي لا يفتها سواديا — وإن تك قدامي أجدها بمرصد

(میں دیکھتا ہوں کہ موت کسی کی عظمت و بزرگی کا کوئی لحاظ نہیں کرتی خواہ دنیا میں وہ کتنا ہی عزت والا ہو، تیری عمر کی قسم! میں خوفزدہ ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میری موت آج ہی آجائیگی یا کل۔ اگر موت میرے پیچھے ہے تو بھی میں اس سے بچ نہیں سکتا اور اگر میرے آگے ہے تو بھی کسی نہ کسی گھات میں مجھے اس سے دوچار ہونا ہے۔)

لیکن ان زہدیہ خیالات کے اظہار سے شاعر کا مقصد کیا ہے، اس کا علم سیاق و سباق کے مطالعہ سے ہی ہوسکتا ہے، اس کے لیے اسی قصیدہ کے مندرجہ ذیل دو اشعار پیش کر دینا کافی ہے۔

ألا أيهذا اللائمي أحضر الوغى — وأن أشهد اللذات هل أنت مخلدي

فإن كنت لا تستطيع دفع منيتي — فدعني أبادرها بما ملكت يدي

(اے میرے ملامت گر جو مجھے اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ میں لڑائیوں میں کود پڑتا ہوں اور لذتوں میں شریک ہوتا ہوں کیا تو مجھے ہمیشہ زندہ رکھ سکتا ہے۔ پس اگر تو موت کو مجھ سے دفع نہیں کرسکتا تو مجھے چھوڑ دے کہ میں اپنی دولت و قوت کو مرنے سے پہلے پوری طرح استعمال کرلوں۔)

ان دو شعروں کی روشنی میں شاعر کا مقصد اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت آزادی و بے فکری کی زندگی بسر کرتا ہے، میدان جنگ میں بے محابا کود پڑتا ہے اور خطرات کی مطلق پروا نہیں کرتا، اور امن و امان کی حالت میں کھل کر داد عیش بھی دیتا ہے اور فردا کی کوئی فکر نہیں کرتا، ایک ملامتگر اس کی زندگی پر اسے ملامت کرتا ہے تو وہ اپنے ملامتگر کو خود اسی کی غلطی پر متنبہ کرتا ہے کہ اگر وہ جنگ میں بے جگری اور بے پروائی سے کام نہ لے تو بھی اسے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا، اسی طرح اگر وہ دنیا کی لذتوں سے منہ موڑلے تو بھی اسے حیات ابدی نصیب نہیں ہوسکتی، موت کا خوفناک پنجہ امیر و غریب، قوی و ضعیف، سخی و بخیل اور بہادر و بزدل الغرض ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے، پس جب موت سے کسی طرح فرار ممکن نہیں ہے اور زندگی کی انتہا بہرحال فنا ہے جس کے بعد کچھ نہیں ہے تو بہتری اسی میں ہے کہ انسان چند روزہ زندگی کو ہنسی خوشی گذار دے اور دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہولے، ان خیالات کا اظہار شاعر نے ایسے دلنشین انداز میں کیا ہے کہ کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، جو شخص حیات اخروی کا قائل نہیں ہے اور جس کے نزدیک موت ہی آخری منزل ہے، وہ جب ان اشعار کو پڑھے گا تو پوری طرح شاعر کی تائید کرے گا اور جو حیات بعد الممات اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہے، اور جس کا عقیدہ ہے کہ دنیوی زندگی

کے اعمال سے اخروی زندگی متاثر ہوگی، وہ جب ان اشعار کا مطالعہ کرے گا تو لامحالہ اس کے قلب و ذہن میں زہدیہ تاثرات بیدار ہوں گے اور زندگی کی بے ثباتی کی تصویر تو بہرحال ہر ایک کی نگاہ کے سامنے پھر جائے گی۔

ایک دوسرے شاعر متمم بن نویرہ نے بھی ایک قصیدہ میں تقریباً یہی اسلوب اختیار کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

صرمت زُنیبۃُ حبل من لا یقطع   حبل الخلیل وللأمانۃ تفجع [1]

(زنیبہ نے اس کا رشتہ کاٹ دیا جو دوست کے رشتہ کو منقطع نہیں کرتا اور وہ امانت کو درد مند کرتی ہے)

متمم بھی اس قصیدہ میں تشبیب کے بعد پہلے اپنی ناقہ اور گھوڑے وغیرہ کے اوصاف بیان کرتا ہے پھر اپنی بادہ نوشی، عیش و مسرت اور لہو و لعب کا ذکر کرتا ہے، اسی اثناء میں اس کو موت یاد آجاتی ہے اور بڑے افسوس کے ساتھ اس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے کہ وہ ایک دن جنگل میں مارا جائیگا اور مردار خور جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے اسوقت کوئی اس کا مدد کرنے والا نہ ہوگا۔ پھر کہتا ہے:۔

ولقد غُبِطتُ بما الاقی حقبۃً   ولقد یمرُّ علیّ یومٌ اشنع

(ایک عرصہ سے میں جس نعمت و لذت اور خوشحالی و کامرانی سے بہرہ یاب ہوں لوگ اس پر رشک کرتے ہیں، حالانکہ ایک برا دن بھی مجھ پر آنے والا ہے۔)

اس کے بعد شاعر کچھ سنبھل جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اس دن سے نہ ڈرنا چاہیے کیونکہ وہ تو بہرحال آکر رہے گا جیسا کہ ماضی کے بڑے بڑے صاحب جاہ و اقتدار بھی اس سے بچ نہیں سکے، اور وہ قوم عاد، آل محرق، ملوک یمن اور اپنے آباء و اجداد کو یاد کرکے کہتا ہے کہ وہ سب موت کے شکار ہوئے اور آج ان کا کوئی نشان باقی نہیں ہے، پھر ان دو شعروں پر قصیدہ ختم کرتا ہے:۔

لابد من تلف مصیب فانتظر   أبأرض قومک ام باخری تصرع

۱؎ المفضلیات، مصر ۱۹۴۲ء، ص ۴۸

ولیاتین علیک یومٌ مرۃً   یُبکیٰ علیک مقنعا لا تسمع

(فنا سے دوچار ہونا لابدی ہے پس اس کا انتظار کر، تو ایک دن ضرور ہلاک ہوگا خواہ اپنے ہی ملک میں ہو یا غیر ملک میں۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جبکہ تیرا چہرہ کفن میں چھپا ہوگا، لوگ تجھ پر روئیں گے اور تو ان کی آواز بھی نہ سن سکے گا۔)

اسود بن یعفر نے ایک موقع پر یہ ترتیب پلٹ دی ہے، وہ قصیدہ کے آغاز ہی میں رنج و غم اور ضعف و پیری کا بیان شروع کر دیتا ہے، اور اسی ضمن میں زوال نعمت اور موت و فنا کی تصویر کھینچتا ہے، اس کے بعد ایام شباب کو یاد کرکے اپنے گذشتہ لہو و لعب، بادہ نوشی، سیر و شکار گھوڑے اور ناقہ کا ذکر کرتا ہے، قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

نام الخلی وما احس رقادی   والھم محتضر لدی وسادی [1]

(فارغ البال ساتھی سو گیا اور مجھے ابھی تک نیند کا کچھ احساس نہیں ہے، غم میرے پاس حاضر ہے اور وہی میری تکیہ گاہ ہے۔)

پھر چند اشعار میں اپنے افکار و آلام اور حوادث و مصائب کے ذکر کے بعد موت کا بیان اس طرح کرتا ہے:

ان المنیّۃ والحتوف کلاھما   یوفی المخارمَ یرقبان سوادی

لن یرضیا منی وفاء رھینۃ   من دون نفسی طارفی وتلادی

(موت اور ہلاکت دونوں بلندیوں سے مجھے تاک رہی ہیں اور یہ دونوں میری جان کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں، مال و دولت کا کوئی فدیہ لے کر بھی جان چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔)

اسکے بعد چند اشعار میں گذشتہ زمانہ کے چند بادشاہوں، سرداروں، انکے قلعوں اور محلوں کا ذکر کرکے کہتا ہے:

جرت الریاحُ علی مکان دیارھم   فکانما کانوا علی میعاد

(ان سب کے علاقوں پر آج سنسان ہوائیں چل رہی ہیں گویا فنا سے انکا کوئی وعدہ تھا جسے انھوں نے وفا کر دیا۔)

۱؎ المفضلیات، ص ۲۱۶

پھر انکی پر مسرت زندگی اور انکی مستحکم سلطنت و امارت کو یاد کرکے سوال کرتا ہے:

این الذین بنوا فطال بناؤھم — وتمتعوا بالاھل والاولاد

(جنھوں نے بڑی بڑی عمارتیں بنوائی تھیں اور جو بڑے کنبے والے تھے اور اہل وعیال سے پوری طرح متمتع تھے وہ سب کہاں گئے ؟)

پھر خود ہی اس طرح جواب دیتا ہے :-

فاذا النعیم وکل ما یلھیٰ بہ — یوما یصیر الی بلی و نفاد

(وہ سب فنا ہوگئے، اور اسی طرح ہر نعمت ولذت جس سے لوگ متمتع ہو رہے ہیں ایک دن فنا کی نذر ہو جائیگی)

موت وفنا کا ذکر متعدد جاہلی شعراء نے کیا ہے، بعضوں نے تفصیل سے بھی کام لیا ہے، لیکن ممزق عبدی نے اس سلسلہ میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس میں وہ بالکل منفرد ہے، اس نے تخیلی طور پر ان معاملات کی عکاسی کی ہے جو مرنے کے بعد اسکے ساتھ کیے جائیں گے، چنانچہ کہتا ہے:[1]

ھل للفتیٰ من بنات الدھر من واق — ام ھل لہ من حمام الموت من راق

کانی قد رمانی الدھر عن عُرُض — بنافذات بلا ریش و افواق

اذ غمضونی وما غمضت من وسن — وقال قائلھم اودی ابن خذّاق

قد رجلونی وما رجّلت من شعث — والبسونی ثیابا غیر اخلاق

وطیّبونی وقالوا ایما رجل — وادرجونی کانی طیّ مخراق

وار سلوا فتیۃ من خیرھم حسبا — لیسندوا فی ضریح التراب اطباق

(کیا انسان کو حوادث دہر سے بچانے والا کوئی ہے؟ خیر اسے چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کیا موت کا علاج کرنے والا کوئی ہے؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے کسی گوشہ سے مجھے ایسا تیر مارا جس میں زہر اور نوک ہے، اس وقت لوگوں نے میری آنکھوں کو بند کر دیا اور میری آنکھیں نیند کی وجہ سے

---

[1] المفضلیات، ص ۳۰۰

بند نہیں ہوئی تھیں اور کہنے والے نے کہا کہ ابن خذاق چل بسا، پھر لوگوں نے میرے بالوں میں کنگھی کرکے ان کو سنوارا، یہ اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ میرے بال پراگندہ تھے، پھر انھوں نے مجھے نیا لباس پہنایا، پھر خوشبو لگائی اور کہا کہ کیا بھلا آدمی تھا، اس کے بعد مجھے کپڑوں کی تہوں میں لپیٹ دیا اور میں اس کپڑے کے مانند ہوگیا جس کو بچے کھیلنے کے لیے لپیٹ کر کوڑے کی طرح بنا لیتے ہیں، پھر بہترین حسب والے جوانوں کو بھیجا کہ میرے جسم کو قبر کے سپرد کر دیں۔)

جاہلی قصائد عام طور پر ایسے مقامات اور کھنڈروں کے نشانات کے ذکر سے اس طرح شروع ہوتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کبھی یہاں قیام کیا تھا، اور اب اثنائے سفر میں اتفاقاً دوبارہ یہاں آگیا ہے اور ان نشانات کو دیکھکر پرانی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہوگئی ہے، یہ انداز بیان عرب شعراء کے لیے بالکل واقعی اور حقیقی ہے، کیونکہ عرب قبائل ہمیشہ خانہ بدوشوں کی طرح چراگاہوں اور چشموں کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے، چند روز کسی چراگاہ میں قیام کرتے، پھر وہاں سے کوچ کر جاتے، اس عارضی قیام کے زمانہ میں مختلف قبیلوں کے درمیان محبت اور عداوت کے متعدد واقعات رونما ہوتے، لہذا جب کبھی دوبارہ اس مقام سے ان کا گذر ہوتا تو پرانی یادوں کا تازہ ہو جانا قدرتی بات تھی، چنانچہ ان کھنڈروں کو دیکھتے ہی شاعر کی نگاہوں کے سامنے گذشتہ زندگی کی تصویریں کھنچ جاتی ہیں، وہ بچے کھچے آثار میں سے ایک ایک کو غور سے دیکھتا ہے اور قرب وجوار کی پہاڑیوں ٹیلوں اور درختوں پر نظر ڈالتا ہے، ان سے اپنی محبوبہ اور بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے متعلق سوال کرتا ہے کہ وہ سب کہاں گئے، اس طرح خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رلاتا ہے، پھر اپنی محبت کے واردات اور جدائی کی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے، یہی حصہ قصیدہ کی تمہید یا تشبیب کہلاتا ہے، اور اکثر قصائد کے شروع میں کم وبیش یہی مضمون ملتا ہے، لیکن کبھی کبھی شاعر اس مضمون کو زیادہ طول دیتا ہے اور اس کے ذیل میں انقلابات زمانہ، حوادث دھر اور گردش ایام وغیرہ

کا ذکر کرنے لگتا ہے جس سے دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائداری کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، مثال کے طور پر عبید بن الابرص کا ایک قصیدہ پیش کیا جاتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

اقفر من اہلہ ملحوب   فالقطبیات فالذنوب [1]

(مقام ملحوب ویران ہوگیا اور قطبیات اور ذنوب بھی سنسان نظر آتے ہیں۔)

اسی طرح متعدد مقامات کا ذکر کرکے کہتا ہے کہ یہ سب انسانوں سے خالی ہوگئے اور اب یہاں جنگلی جانور گھومتے پھرتے ہیں، حوادث نے ان کے حالات کو متغیر کردیا ہے، یہ دنیا ہی ایسی جگہ کہ یہاں جو کوئی آتا ہے لوٹ لیا جاتا ہے یا قتل کردیا جاتا ہے یا ہلاک ہوجاتا ہے، موت ہی اس دنیا کی اصلی وارث ہے، اگر کوئی جوانی میں موت سے بچ کر بڑھاپے تک پہنچ بھی گیا تو بڑھاپا تو خود ایک عیب ہے،

اس کے بعد چند اشعار میں مختلف تشبیہات کے ذریعہ اپنی اشکباری و گریہ وزاری کو بیان کرکے پھر اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ مقامات متغیر ہوگئے اور یہاں کے بسنے والے منتقل ہوگئے یا آبادی کے بعد اب یہاں کی فضا ویران ہوگئی اور خشک سالی اور قحط کے آثار نمودار ہوگئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس کی توجیہ وہ اس طرح کرتا ہے:

فکل ذی نعمۃ مخلوس   وکل ذی أمل مکذوب

وکل ذی ابل موروث   وکل ذی سلب مسلوب

وکل ذی غیبۃ یؤوب   وغائب الموت لایؤوب

(یہاں ہر نعمت والے کی نعمت چھین لیجاتی ہے اور ہر امید والے کی امید باطل کردیجاتی ہے ہر اونٹوں والے کے اونٹ دوسرے کی وراثت میں چلے جاتے ہیں اور ہر سامان والے کا سامان لوٹ لیا جاتا ہے۔ اور ہر غائب ہونے والا ایک دن واپس آجاتا ہے لیکن موت جس کو غائب کردے وہ کبھی واپس نہیں آتا۔)

[1] دیوان عبید بن الابرص، بیروت، ۱۹۵۸ء ص ۲۳

اسی سلسلہ میں مرقش اصغر کے اس قصیدہ پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:-

لابنۃ عجلان بالجو رسوم   لم یتعفین والعہد قدیم [1]

لابنۃ عجلان اذ نحن معا   وای حال من الدہر تدوم

(مقام جو میں بنت عجلان کے گھروں کے نشانات ہیں جو ابھی بالکل محو نہیں ہوئے ہیں اگرچہ کافی زمانہ گذر چکا ہے۔ یہ بنت عجلان کے اس زمانے کے گھر ہیں جبکہ ہم یہاں ساتھ رہتے تھے اور زمانہ کی کوئی حالت ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔)

اس کے بعد افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ اب یہ مقام ویران ہوگیا حالانکہ اس سے قبل یہاں بڑے بڑے اونٹوں کے گلے والے لوگ رہتے تھے، اب وہ سب ہلاک ہوگئے، پھر اپنی محبوبہ بنت عجلان کی تعریف و توصیف میں مشغول ہوجاتا ہے، اس کے بعد اپنی شب تنہائی اور غم جدائی وغیرہ کا ذکر کرکے آخر میں پھر حوادث دہر اور انقلابات زمانہ کا بیان کرنے لگتا ہے، اس مقام کے چند اشعار یہ ہیں:-

کم من اخی ثروۃ رایتہ   حل علی مالہ دہر غشوم

ومن عزیز الحمی ذی منعۃ   اضحی وقد اثرت فیہ الکلوم

بینا اخو نعمۃ اذ ذہبت   وحولت شقوۃ الی نعیم

وبینا ظاعن ذو شقۃ   اذ حل رحلا واذ خف المقیم

وللفتی غائل یغولہ   یا بنۃ عجلان من وقع الحتوم

(میں نے بہت سے دولتمندوں کو دیکھا جن کے مال و دولت کو زمانے نے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، اور بہت سے عالی مقام اور عزت و رفعت والے لوگوں کو دیکھا جن پر اب زخموں کے نشانات ہیں،

[1] المفضلیات، ص ۲۴۷

دیکھتے دیکھتے کتنے نعمت والوں کی نعمت چلی گئی اور نعمت کی جگہ شقاوت آگئی۔ ناگاہ لمبے سفر والے مسافر نے کجاوہ کھول دیا اور اقامت گزیں ہوگیا اور جو مقیم تھا وہ سفر پر روانہ ہوگیا۔ اے بنت عجلان! انسان کے پیچھے ایک ہلاک کرنے والا لگا ہے جو اسے ضرور ہلاک کرے گا، اور ایک دن یقیناً موت اس کو پکڑ لے گی۔)

جاہلی شعرا جب اپنی سخاوت و فیاضی پر فخر کرتے ہیں تو اس مضمون کے تحت بھی کبھی کبھی زوالِ نعمت و مال اور بے ثباتی احوال کا بیان کرنے لگتے ہیں، جود و سخا کا مضمون جاہلی شاعری میں کثرت سے ملتا ہے لیکن اس کے اسالیب بیان مختلف ہوتے ہیں، ایک اسلوب یہ ہے کہ شاعر پہلے کسی ملامتگر کو مخاطب کرتا ہے اور ملامت و نصیحت کا فریضہ عام طور پر کسی عورت کے سپرد کرتا ہے جو شاعر کو اس کی فضول خرچی پر ملامت کرتی ہے، اور نصیحت کرتی ہے کہ وہ اس قدر بے پروائی سے دولت صرف نہ کرے بلکہ احتیاط سے کام لے، پھر شاعر اس کو جواب دیتا ہے کہ وہ بذلِ مال کے ذریعہ شہرت حاصل کر رہا ہے تاکہ مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہے، کیونکہ ایک دن وہ ضرور ہلاک ہوگا جس طرح اس سے پہلے کے لوگ ہلاک ہوئے، اس وقت اس کی دولت پر اس کا کوئی تصرف نہ ہوگا، وہ اس کے وارثوں کے قبضہ میں ہوگی اور اس کے کچھ کام نہ آئے گی، اس مضمون کو متعدد شعراء نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر لبید کا ایک قصیدہ[1] پیش کیا جاتا ہے جس میں شروع سے آخر تک اسی مضمون کی جھلک پائی جاتی ہے، قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

أعاذل قومی فاعذلی الآن اوذری   فلستُ وان اقصرتِ عنی بمقصرِ

أعاذل لا واللہ ما من سلامة   ولو اشفقت نفس الشحیح المثمر

(اے ملامت کرنے والی! اٹھ، مجھے اب ملامت کر یا نہ کر، اگر تو اپنی ملامت سے باز بھی رہے تو بھی میں اپنی عادت سے باز آنے والا نہیں ہوں
اے ملامت کرنے والی! دولتمند بخیل خواہ کتنا ہی خوف یا طمع کرے ہلاکت و حوادث سے سلامتی ممکن نہیں ہے)

[1] دیوان لبید، [illegible] ص ۶۲

اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ میں بذلِ مال کے ذریعہ مدح و ثنا اور شہرت و عزت حاصل کرتا ہوں، کیونکہ میں ان لوگوں سے زیادہ زندہ رہنے والا نہیں ہوں جو مجھ سے پہلے زندگی گذار چکے۔ یہاں سے یہی مضمون تقریباً تیس بتیس اشعار تک مسلسل چلتا ہے، شاعر متعدد اشخاص کے نام گناتا ہے اور ان کی موت و ہلاکت کا ذکر کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ ملامت گر کے سامنے فنا اور نیستی کی تصویر پیش کرکے اس کو بتانا چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہی صحیح ہے یعنی مال خرچ کرنا ہی بہتر ہے، پھر کہتا ہے کہ ہم اس دنیا کی بہت ہی کمزور مخلوق ہیں، اور آج جہاں بھی ہم قیام کرتے ہیں ہم سے پہلے لوگ وہاں مقیم رہ چکے ہیں، آخر میں قصیدہ اس طرح ختم ہوتا ہے

وانّا واخوانا لنا قد تتابعوا   لکالمغتدی والرائح المتهجّر

هل النفس الا متعة مستعارة   تعار فتأتی ربها فرط اشهر

(ہمارے بھائی جو ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے ان کی اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے صبح کو جانے والا اور شام کو جانے والا۔ جان محض ایک مستعار چیز ہے جو عاریت کے طور پر دی جاتی ہے، پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے مالک کے پاس واپس چلی جاتی ہے۔)

حوادث و مصائب، تباہی و بربادی اور موت و فنا کے بیان کے لیے ایک وسیع میدان مرثیہ بھی ہے، جاہلی شاعری کا معتدبہ حصہ مراثی پر مشتمل ہے، شعراء عموماً اپنے اعزہ و اقربا یا سرداران کے مرنے پر مرثیہ کہتے تھے جس میں اپنے رنج و غم کا اظہار اور متوفی کے اخلاق و عادات کی تعریف و توصیف کرتے، اگر متوفی مقتول ہوتا تو طلب انتقام کے لیے جوش دلاتے اور اگر کسی حادثہ یا مرض سے اس کی موت واقع ہوتی تو حوادث زمانہ اور گردش روزگار کا ذکر کرکے قضا و قدر کے آگے سر جھکا دیتے اور اس ضمن میں انسان کی بے بسی اور بیچارگی کا اظہار طرح طرح سے کرتے

لبید نے اپنے بھائی اربد کے مرنے پر بہت سے مرثیے کہے ہیں، ان میں سے ایک کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کا مطلع یہ ہے :۔

بلینا و ما تبلی النجوم الطوالع — وتبقی الجبال بعدنا والمصانع[1]

(ہم فنا ہو جائیں گے اور یہ طلوع ہونے والے ستارے فنا نہ ہوں گے۔ یہ پہاڑ اور قلعے ہمارے بعد بھی اسی طرح باقی رہیں گے۔)

اس موقع پر اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جاہلی شعراء کے افکار و خیالات عام طور پر براہ راست زمانہ کے تجربات اور دنیا کے مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں، ان میں زیادہ گہرائی یا پیچیدگی نہیں ہوتی، بلکہ وہ عموماً بہت سادہ، عام فہم اور بدیہی اور انکی صحرائی زندگی کے حسب حال ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے دن میں پہاڑوں کے طویل سلسلے اور رات میں آسمان پر بےشمار ستاروں کے جلوے ہی ہوتے تھے، جن کے استقلال و استحکام کو دیکھ کر انسانی زندگی کی ناپائداری کا خیال آنا بالکل فطری بات ہے، کون انسان ہے جس نے رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ کر کبھی یہ نہ سوچا ہو کہ ایک دن ایسا آئے گا جب کہ وہ نہ ہوگا اور ستارے اسی طرح چمکتے ہوں گے،

اس کے بعد شاعر اپنے بھائی کی موت پر افسوس کرتا ہے، پھر یہ کہکر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر زمانہ نے ہمارے درمیان جدائی پیدا کر دی تو کوئی رنج کی بات نہیں ہے کیونکہ زمانہ کا تو ایک دن ہر انسان کو شکار ہونا ہی پڑتا ہے، اس مضمون کو اس نے متعدد اسالیب میں پیش کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

وما الناس الا کالدیار و اھلھا — بھا یوم حلوھا و غدوا بلاقع

(لوگوں کا حال دیار اور اہل دیار کے مانند ہے کہ وہ آج وہاں قیام کرتے ہیں اور کل وہ ویران ہو جاتے ہیں۔)

وما المرء الا کالشھاب وضوئه — یحور رمادا بعد اذ ھو ساطع

(انسان تو بس شہاب کے مانند ہے جو روشن ہوتا ہے پھر فوراً خاکستر ہو جاتا ہے)

---

[1] دیوان لبید، ص ۲۱

وما المال والاھلون الا ودیعة — ولا بد یوما ان ترد الودائع

(مال اور اہل و عیال سب امانت ہیں اور امانتوں کا ایک دن واپس کرنا ضروری ہے۔)

ویمضون ارسالا ونخلف بعدھم — کما ضم اخری التالیات المشائع

(لوگ گروہ کے گروہ چلے جا رہے ہیں اور ہم انکے پیچھے ایسے ہی ہیں جیسے اونٹوں کی قطار کے پیچھے ہانکنے والا ہوتا ہے)

وما الناس الا عاملان فعامل — یتبر ما یبنی وآخر رافع

(لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو عامل ہوں، ایک تو اپنی تعمیر کو ڈھا رہا ہو اور دوسرا بلند کر رہا ہو)

زندگی کی ناپائداری اور ہلاکت و بربادی کی تصویر مرثیوں میں اکثر اس طرح بھی ملتی ہے کہ شعرا اپنی تسکین خاطر کے لیے گذشتہ زمانہ کے جابر و قاہر بادشاہوں اور قوموں کا حال بیان کرتے ہیں اور کبھی ان جانوروں اور پرندوں کا ذکر کرتے ہیں، جو زیادہ طاقتور یا طویل العمر ہوتے ہیں، مثلاً شیر، عقاب، اژدہا، پہاڑی بکرا اور جنگلی گدہا وغیرہ۔ پھر انکی موت و ہلاکت کا بیان کرتے ہیں، اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب ایسی مخلوقات بھی موت سے نہ بچ سکیں تو کون بچ سکتا ہے، اس طرح وہ اپنے غم کو تسکین دیتے ہیں۔

اس قسم کا مضمون اکثر مرثیوں میں پایا جاتا ہے، یہاں مثال کے طور پر صرف ابوذؤیب ہذلی کے ایک مرثیہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، جسے اس نے اُس وقت کہا تھا جب اس کے پانچ بیٹے ایک ہی سال کے اندر طاعون کی وبا میں مر گئے تھے، مطلع اس طرح ہے :۔

أمن المنون وریبھا تتوجع — والدھر لیس بمعتب من یجزع[1]

(کیا تو زمانہ اور اسکے حوادث سے دردمند ہے، زمانہ تو کسی کے درد کو دور نہیں کرتا خواہ وہ کتنا ہی آہ و بکا اور جزع و فزع کرے)

اس کے بعد اپنے درد و غم اور رنج و الم کا بیان شروع کر دیتا ہے، اس سلسلہ کے چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں۔

---

[1] جمہرة اشعار العرب، بیروت ۱۹۶۳ء ص ۲۴۱

ولقد حرصت بان ادافع عنهم — فاذا المنية اقبلت لا تدفع

(میں نے انکی مدافعت کی خواہش کی تھی، ناگاہ میں نے دیکھا کہ یہ تو موت ہے جس کو کسی طرح دفع نہیں کیا جا سکتا۔)

واذا المنية انشبت اظفارها — الفيت كل تميمة لا تنفع

(جب موت نے اپنے پنجے چبھو دیے تو میں نے ہر تعویذ کو بے سود پایا۔)

پھر اپنے صبر و تحمل کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:-

والنفس راغبة اذا رغبتها — واذا ترد الى قليل تقنع

(نفس کو اگر تم ترغیب دو تو اس کے اندر رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اسے تھوڑی چیز پر روک دو تو وہ قانع بھی ہو جاتا ہے۔)

اسکے بعد اس مرثیہ میں تین حصے نمایاں طور پر آتے ہیں اور ہر حصہ کی ابتدا اس مصرع سے ہوتی ہے:-

ع والدهر لا يبقى على حدثانه — یعنی زمانہ کے حوادث سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

پہلے حصہ میں شاعر ایک طاقتور جنگلی گدھے کا بیان کرتا ہے جو جنگل میں مامون و محفوظ تھا، لیکن اچانک ایک شکاری نے اس کو تیر مارا اور وہ اسی وقت ہلاک ہو گیا،

دوسرے حصہ میں ایک جنگلی بیل کا ذکر ہے، جو رات بھر بارش سے بچنے کے لیے ایک درخت کے نیچے کھڑا رہا، صبح ہوتے ہی کچھ شکاری کتوں نے اس پر حملہ کیا، اس نے ان کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر کتوں کے مالک کے تیر سے وہ بھی ہلاک ہو گیا،

تیسرے حصہ میں ایک بہادر آدمی کا حال بیان کرتا ہے، جس کا مقابلہ ایک دوسرے پہلوان سے ہوا، اس نے اپنی بہادری کا کمال دکھایا، لیکن آخر کار زخمی ہو کر گر پڑا اور ہلاک ہو گیا،

اس طرح شاعر نے عجیب و غریب انداز میں موت و ہلاکت کا نقشہ کھینچا ہے، اور اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے کہ موت بہرحال غالب و قاہر ہے اور اس سے کسی طرح مفر ممکن نہیں ہے۔

(باقی)

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

۲- ضلع بریلی (۴)

از جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی

(۸)

متذکرہ بالا شعراء (جن میں سے زیادہ تر گذشتہ صدی کے آخری زمانے یا موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں گزرے ہیں) کے علاوہ دور جدید میں بھی بریلی میں کئی خوش فکر شعراء تھے، اور چند اب بھی موجود ہیں، مولانا سید عبد الودود مرحوم یہاں کے ممتاز شاعر اور اہل قلم تھے، جن کا ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا، ان کا مجموعۂ کلام متاع درد محترمی عبد الشکور صاحب کے مقدمہ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکا ہے، مرحوم نہایت ذہین بزرگ تھے، عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں پر قدرت کامل حاصل تھی، برجستہ شعر کہتے تھے، اور نظم برداشتہ نثر لکھتے تھے، بریلی کے ممتاز قومی رہنما اور اسلامیہ کالج بریلی کے بانی تھے، عزیز حسین خاں عزیز بریلوی اور احفاد حسین صاحب عبد الودود صاحب کی صحبت میں فیض اٹھانے والوں میں تھے، اول الذکر وکیل تھے، مگر بعد میں گوشہ نشین ہو گئے تھے، بہت کم شعر کہتے تھے، لیکن جو کچھ کہتے تھے، خوب کہتے تھے، اور کلام نہایت پر اثر ہوتا تھا، ۱۹۶۲ء میں ان کا انتقال ہوا، آخر الذکر نے عین جوانی میں وفات پائی، بڑے طباع نوجوان تھے، کچھ عرصہ تک "مدینہ" کے اڈیٹر رہے تھے، مساجد بریلوی حافظ رحمت خاں کی اولاد میں تھے، عین جوانی میں وفات پا گئے۔ بقول انور صابری

اگر زندہ رہتا تو رشک عرفی اور فخر غالب ہوتا" ساجد نقائص اقرز نامی ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں[1]،

کیفی بریلوی بھی موجودہ زمانے کے شاعر ہیں، محکمۂ ریلوے میں ملازم ہیں، مشاعروں کی جان سمجھے جاتے ہیں[2]، شیام موہن لال جگر بریلوی کنھیا لال دل مرحوم کے چوتھے صاحبزادے ہیں، ۱۸۹۰ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے بی اے پاس کیا اور ۱۹۱۸ء میں نائب تحصیلدار ہوگئے، مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں ہیں اور بریلی کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں، ۱۹۵۲ء میں اپنے صاحبزادے کے پاس جو میرٹھ کالج میرٹھ میں لکچرر ہیں، میرٹھ چلے گئے اور ابتک وہیں مقیم ہیں[3]، ان کی نثر و نظم میں متعدد تصانیف ہیں جو شائع بھی ہو چکی ہیں، ان میں شعری مجموعے درج ذیل ہیں، پپیہا اور پی کہاں، رنگ و بو، گلدستہ درپن، پیام ساوتری، انتخاب غزلیات، اور رس (رباعیات کا مجموعہ)۔ جگر کے چند اشعار بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہیں:-

کسی میکدے میں، یا جگر کہ تھا محو خواب میں رات بھر
ہوئیں کیا بشارتیں صبحدم کہ اٹھا تو زمزمہ خواں اٹھا

کیونکر کہوں زباں سے تو مہرباں نہیں
لیکن مرا نصیب کہ میں شادماں نہیں

ناوک غم سے مجھے سینہ سپر ہونے دو
اشک کی نذر دل و جان و جگر ہونے دو

دل نے ازل میں کہہ کے یہ ویرانہ لے لیا
کس سے اٹھیں گے ناز چمن میں بہار کے

تیری رحمت سے ناامید نہیں
اپنی محرومیوں سے ڈرتا ہوں

لا رہا ہوں انھیں تصور میں
اپنے خاکہ میں رنگ بھرتا ہوں

بے خبر حیات تھا غم نے مجھے جگا دیا
زیست کا راز کھول موت کا آسرا دیا

حیف کہ بیکسی کی شرم آج جگر نہ رکھ سکی
اجڑے ہوئے مزار پر کس نے دیا جلا دیا

---

[1] وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا (مصنف انور صابری) [2] ایضاً

[3] یادرفتگاں، (پیش لفظ)

رباعی

جب رنج سے دل نڈھال ہو جاتا ہے
جب حد سے سوا ملال ہو جاتا ہے
محویت غم سے دل کی گہرائی میں
محسوس ترا وصال ہو جاتا ہے

رباعی

یا زیست کو اک دردِ مبہم سمجھیں
یا بانیٔ بیداد تجھے ہم سمجھیں
غم کی یورش اور اتنی یورش یارب
تیری قدرت کو کس طرح کم سمجھیں

زمانہ حال کے ایک دوسرے شاعر حضرت وسیم بریلوی ہیں، وہ بریلی کالج بریلی میں اردو کے لکچرار ہیں، اور موجودہ زمانے کے بریلی کے ممتاز شعراء میں ان کا شمار ہے، اچھا کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں، جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے، ان کا ایک مجموعۂ کلام زیر طبع ہے۔

موجودہ صدی میں بریلی میں شاعروں کے علاوہ کچھ شاعرات بھی ایسی گذری ہیں جن کے ذکر کے بغیر بریلی کے اردو ادب کے متعلق مضمون نامکمل رہتا ہے، ان میں زینت بیگم عبرت ڈاکٹر خوب داد خاں کی بیٹی تھیں غالباً ۱۸۸۸ء میں بریلی میں پیدا ہوئی تھیں، کلام پرانی وضع کا ہے، نمونہ درج ذیل شعر ہے[1]:-

نہ ہوتا دل تو کوئی کیوں کسی پر مبتلا ہوتا
حسیں ہوتے تو کیا تھا دلربا ہوتے تو کیا ہوتا

شہزادی تیمور جہاں حجاب، دہلی کے تیموری خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اپنے شوہر کے ساتھ عرصہ تک بریلی میں مقیم رہیں، مغلیہ سلطنت کی بربادی اور مسلمانوں کی تباہی ان کے پسندیدہ مضمون ہیں، انگریزی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں دستگاہ رکھتی تھیں، اقبال کے رنگ کی شیدائی تھیں[2]، ان کی دو رباعیاں درج ذیل ہیں:-

---

[1] تذکرۂ شاعرات اردو، ص ۵۵۰ [2] ایضاً ص ۳۲۵

عبرت کدۂ دہر کے والی ہم ہیں   افسوس کہ وقف پائمالی ہم ہیں

تیمور کے ہاتھوں نے لگایا تھا جسے   اس نخل کی سوکھی ہوئی ڈالی ہم ہیں

تھے کبھی سلطنت ہند کے ہم بھی حقدار   رشک اسکندر و قیصر تھا ہمارا دربار

بدلی قسمت نہ رہا عہد حکومت تیمور   وہی ہم آج ہیں رنجور و اسیر افکار

آمنہ خاتون عفت بریلی کے ایک ذی علم خاندان کی فرد ہیں، ۱۹۰۳ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئیں، لیکن اپنے والد کی ملازمت کی وجہ سے الہ آباد میں پرورش ہوئی، نمونۂ کلام درج ذیل ہے[1]:

میں ہر ذرے میں تجھکو پارہا ہوں   مجھے دیر و حرم سے واسطا کیا

مرے اعمال نے کشتی ڈبو دی   شکایت ہائے دست ناخدا کیا

ہر اک آنسو ہے روح عشق عفت   دُر و گوہر سے اس کو واسطا کیا

آمنہ خاتون عفت کی چھوٹی بہن سپہر آرا خاتون پنہاں کا ذکر فارسی گو شعراء کے ساتھ کیا جاچکا ہے، اردو میں وہ طالب الہ آبادی سے مشورۂ سخن کرتی تھیں، ان کی عمر کا زیادہ حصہ الہ آباد میں بسر ہوا، جہاں وہ اپنے والد کے زمانۂ حیات میں مقیم تھیں اور ۱۹۲۲ء میں اپنی شادی کے بعد مستقلاً رہنے لگیں، ۱۹۲۹ء میں ایک مجموعہ نظم اشک خونی اپنے والد کی یاد میں شائع کیا، نظموں اور افسانوں کے مجموعے بھی مرتب کیے تھے، اردو شاعری سے زیادہ فارسی شاعری سے لگاؤ تھا، اردو شاعری کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں[2]:

تجلیوں نے نقاب الٹا لبوں پہ آیا حسیں تبسم   نوید آئینۂ تجلی تجھے وہ خود بنا رہے ہیں

بہ پیچ و تاب زلف پیچاں خم بہ خم   کون کہتا ہے جنوں ناکام ہے

بلقیس جمال جمالہ، عفت اور پنہاں کی چھوٹی بہن ہیں، ان کا ذکر بھی فارسی گو شعراء کے

1. تذکرۂ شاعرات اردو، ص ۵۶۲ 2. ایضاً ص ۳۸۵

سلسلہ میں کیا جاچکا ہے، یہ ۱۹۰۹ء میں بریلی میں پیدا ہوئیں، الہ آباد میں زندگی کا ابتدائی دور گزرا، انکے تین شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں:۔

عدم سے جوشش وحشت میں تا وجود آئی   کہاں سے کھینچ کے مجھکو قضا کہاں لائی

جمال یار کے جانب نگاہ کیوں اٹھے   نظر کو ان کے ہے اندیشۂ مسیحائی

چاند ہو ماند چاندنی پھیکی   غیرت ماہتاب آ تو سہی

حسن آرا غزالہ عفت، پنہاں اور بلقیس جمال کی سب سے چھوٹی بہن ہیں، ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۲۷ء میں ازدواجی زندگی میں منسلک ہوئیں، غزلوں کا ایک مجموعہ بعنوان غزل شائع ہوچکا ہے، نظمیں اور غزلیں خوب کہتی ہیں[1]، چند شعر پیش ہیں:

اے ظلمت شام جنوں وجہ پریشانی نہ پوچھ   اے پرتوئے سوز دروں تمہید حیرانی نہ پوچھ

میں اک حجاب درد ہوں کیا پوچھنا فرگان نم   ہوں خوگر مشق الم اشکوں کی ارزانی نہ پوچھ

عارض ہیں برق خندہ زن اک اس طرف اک اس طرف   آنکھیں ہیں دو نرگس چمن اک اس طرف اک اس طرف

پلکوں کی جنبش اک طرف آنکھوں کی لغزش اک طرف   دو ساحری ہیں خندہ زن اک اس طرف اک اس طرف

لوٹ لے میرا متاع زندگی   اے نگاہ ناز یہ پیغام ہے

زہرہ خاتون زریں خان بہادر خوب داد خاں کی نواسی ہیں، اگرچہ خود ان کا قیام زیادہ تر گوالیار میں رہا، شاعری میں اپنی بڑی بہن بلقیس فاطمہ بیکس کی شاگرد ہیں[2]، ان کا ایک شعر پیش ہے:

یہ زخم دل بھی ابھی مندمل ہوئے تھے خدا   کہ ایک چوٹ پڑی اور شیشۂ دل پر

برجیس جو د نازش کے والد سید ریاض الحسن سیرم انسٹی ٹیوٹ ایزٹ نگر میں ڈپٹی ڈائرکٹر تھے، نازش ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئیں اور نہایت کم عمری سے شاعری کی طرف متوجہ ہوئیں، قصیدہ،

1. تذکرۂ شاعرات اردو، ص ۵۶۸ 2. ایضاً ص ۴۰۴

نعت، منقبت وغیرہ سب ہی کچھ کہتی تھیں، کل اٹھارہ برس زندہ رہیں، لیکن اس عمر میں جو کچھ کہا
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر عمر وفا کرتی تو ایک عظیم شاعرہ ہوتیں، افسوس ہے کہ ان کا کلام
بھی تلف ہو گیا[1]، یہاں ان کا صرف ایک شعر پیش ہے،

کہیں گریہ ہو رہا ہو کہیں رقص شادمانی ہے عجیب حیرت افزا یہ طلسم زندگانی

دوسری جگہوں کی طرح بریلی میں بھی نثر نگاروں کی تعداد شعراء کی بہ نسبت بہت کم ہے، یہاں کے
نثر نگار دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں، ایک گروہ ان حضرات کا ہے جنھوں نے اپنی علمی و ادبی
سرگرمیاں صرف مذہب تک محدود رکھیں، دوسرا گروہ ان نثاروں کا ہے جنھوں نے مذہبی علوم
کے علاوہ دوسرے مباحث پر تصانیف کیں، مذہبی لٹریچر میں پہلی تصنیف غالباً مفتی عنایت احمد صاحب
بریلوی کا فرائض سے متعلق ایک رسالہ علم الفرائض و ملخصات الحساب ہے جو ۱۲۶۲ھ (مطابق
۱۸۴۶ء) میں تصنیف کیا گیا، اسی زمانہ میں بریلی میں علماء کا ایک خاندان ابھر رہا تھا جس کے
بانی مولوی رضا علی خاں صاحب (پیدائش ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء وفات ۱۲۸۲ھ
مطابق ۱۸۶۵ء) خلف مولوی کاظم علی خاں صاحب بن محمد اعظم شاہ ابن محمد سعادت یار خاں بہادر
تھے[2]، اس خاندان سے تعلق رکھنے والے علماء کی زیادہ تصانیف مناظرہ پر مشتمل ہیں، مولوی رضا علی خاں صاحب
کے صاحبزادے مولانا نقی علی خاں صاحب (پیدائش ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء، وفات ۱۲۹۷ھ
مطابق ۱۸۸۰ء) ایک خاص مکتب فکر کے بانی تھے، انھوں نے اپنی تمام عمر اشاعت سنت نبوی
اور رد بدعت میں صرف کر دی، عربی، فارسی اور اردو میں بہت سی کتابوں اور رسائل کے
مصنف ہیں، جن میں چند یہ ہیں[3]، الکلام الاوضح فی تفسیر الم نشرح (یہ ایک ضخیم تصنیف
ہے اور علوم کثیرہ پر مشتمل ہے)، وسیلۃ النجات (یہ رسول مقبولؐ کی سوانح حیات ہے)،

[1] تذکرہ شاعرات اردو ص ۲۲، [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۶۴۔ حیات اعلیٰ حضرت، ج اول ص ۲
[3] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۰

سرور القلوب فی ذکر محبوب، جواہر البیان فی اسرار الارکان، اصول الرشاد، ہدایت البریہ
الی الشریعۃ الاحمدیہ، ازالۃ الاوہام، تزکیۃ الایقان فی رد تقویت الایمان، فضل العلم
والعلماء، الکواکب الزہرا فی فضائل العلم و آداب العلماء، ہدایۃ المشارق الی سیر النفس
والآفاق، اجمل الفکر فی مباحث الذکر، عین المشاہدہ، نہایۃ السعادت، ترویح الارواح۔
تجمل حسین بریلوی بھی مولوی نقی علی خاں صاحب کے ہم عصر تھے، انھوں نے ۱۸۷۲ء میں
سراج الحرمین تصنیف کی، مولوی احمد رضا خاں صاحب خلف مولوی نقی علی خاں صاحب
۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ (مطابق ۱۸۵۵ء) کو بریلی میں پیدا ہوئے، علوم درسیہ اپنے والد سے
حاصل کیے، ۱۲۹۵ھ میں ان ہی کے ساتھ زیارت حرمین سے مشرف ہوئے، اور وہاں کے
برگزیدہ علماء سے فیض حاصل کیا، انھوں نے ۱۲۹۹ھ (مطابق ۱۹۲۱ء) میں بریلی میں
وفات پائی، صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں: تجلی الیقین، اقامت القیامت،
سلطنت مصطفیٰ، القیام المسعود، السماع الاربعین، منتہی التفضیل بہ مبحث التفضیل
مطلع القمرین، الکلام البہی فی تشبیہ الصدیق بالنبی، احیاء القلب المیت بنشر مناقب
اہل البیت، الاحادیث الروایہ لمناقب الصحابی معاویہ، الاہلال بفیض الاولیاء بعد از
وصال، انہار الانوار، ازہار الانوار، طوالع النور فی حکم السراج علی القبور، مجیر معظم
حیات الموات فی سماع الاموات، منیر العین، نسیم صبا، البارقۃ الشارقۃ علی مارقۃ المشارقۃ، النجوم
الثاقب فی تخریج احادیث الکواکب، الروض البہیج فی آداب التخریج، عبقری حسان فی اجابۃ
الاذان، حسن البراعۃ فی تنفید حکم الجماعۃ، العطایا النبویہ فی فتاوی الرضویہ، اعتبار المطالب
بہ مبحث ابی طالب، حسام الحرمین، الدولۃ الاغلبیہ، آخر الذکر دونوں عربی میں ہیں،
جن کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے[1]، احمد رضا خاں صاحب کے چند معاصرین نے بھی

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶

مناظرہ پر کتب و رسائل تصنیف کیے، مولانا سلطان احمد خاں نے ۱۳۱۶ھ (مطابق ۱۸۹۸ء) میں شرق اقدس لکھی، حافظ یقین الدین قادری نے ۱۳۱۴ھ (مطابق ۱۸۹۶ء) میں غزوۃ الہدام سماک الندوہ نامی رسالہ لکھا، مولوی عبدالحمید بریلوی نے ۱۳۱۶ھ میں ایک رسالہ سہم الغیب تصنیف کیا، مولوی مصطفیٰ خاں قادری نے ۱۳۳۱ھ (مطابق ۱۹۱۳ء) میں الرمح الدیانی علی راس الوسواس الشیطانی تصنیف کی، مولوی محمد حامد رضا خاں صاحب نے ۱۳۳۲ھ (مطابق ۱۹۱۴ء) میں فقہ پر ایک کتاب سلامۃ اللہ لاہل السنہ لکھی، محمد ہدایت علی (متوفی ۱۹۰۴ء) الکلام الاحسن کے مصنف ہیں، محمد لیاقت علی بن ذاکر علی بریلوی نے ۱۳۲۶ھ (مطابق ۱۹۰۸ء) میں منطق پر ایک رسالہ مختصر المیزان تصنیف کیا اور عرفان علی بریلوی نے شیخ عبدالحق دہلوی کی تصنیف جذب القلوب فی دیار المحبوب کا راحت القلوب کے نام سے ترجمہ کیا۔

بریلی کے غیر مذہبی اردو نثر نگاروں میں اولین نثار جن کا پتہ چلتا ہے، محمد حسن رضا خاں ابن کامگار خاں، ابن محمد الیار خاں خلف حافظ رحمت خاں ہیں، انھوں نے نواب احمد علی خاں والیٔ رامپور کے عہد میں تیوفلن مالو کی فرمائش پر ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۸۳۴ء) میں اخبار حسن تصنیف کی جو روہیلکھنڈ کی ایک عام اور اردو زبان میں وہاں کی پہلی تاریخ ہے[1]۔ اس کے علاوہ فن تاریخ میں انیسویں صدی میں ایک اور تصنیف ہوئی، یہ کتاب نیاز احمد خاں ہوش کی تاریخ روہیلکھنڈ ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد لکھی گئی، اس تاریخی ادب کے علاوہ موجودہ صدی میں بھی کچھ بریلوی اہل قلم نے عام اردو ادب میں قیمتی اضافے کیے، پرنسپل عبدالشکور صاحب جو رضا کالج رامپور سے رٹائر ہونے

---

[1] اخبار حسن (مخطوطہ رامپور)

کے بعد اب تصنیف و تالیف کی پرسکون زندگی گذار رہے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن کے نام درج ذیل ہیں، اردو کے چند ہندو اردو شعراء، اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حسرت موہانی، غمگین دہلوی۔ ان کی تمام تصانیف شائع ہو چکی ہیں، ان کے علاوہ ایک اور کتاب تاریخ ادب اردو ابھی زیر طبع ہے، الطاف بریلوی صاحب حیات حافظ رحمت خاں اور چند دوسری کتابوں کے مصنف ہیں، جمیل احمد صاحب کی ایک تصنیف اردو شاعری کی مختصر تاریخ ۱۹۴۱ء میں اور ایک دوسری تصنیف تذکرہ شاعرات اردو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئیں، ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب کا تحقیقی مقالہ سرشار، ایک مطالعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، شیام موہن لال جگر جن کا ذکر اردو شعراء کے ضمن میں ہو چکا ہے، نثر میں یادرفتگاں، صحت زبان، حدیث خودی اور جدید تغزل کے مصنف ہیں، عبادت یار خاں صاحب بریلوی دور جدید کے مشہور نقاد اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے چند اردو ادب کا ارتقاء، روایت کی اہمیت، مطالعۂ مومن، تنقیدی زاویے، جدید اردو شاعری ہیں عبادت صاحب کا بچپن اور عنفوان شباب لکھنؤ میں گزرا، جہاں وہ گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے، اس کے بعد دہلی یونیورسٹی میں ملازمت کی، اور پاکستان بننے کے بعد ترک وطن کر گئے، کئی سال تک لندن یونیورسٹی میں اردو کے استاد رہ کر اب لاہور واپس آ گئے ہیں، اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں، وہ اگرچہ بریلی میں بہت کم رہے، پھر بھی ان کا تعلق اسی زمین سے ہے۔

استدراک محترمی شاہ صاحب! السلام علیکم

آپ کی خدمت میں "شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز" کی دوسری قسط بریلی سے متعلق روانہ کرچکا ہوں، امید ہے کہ آپ کو یہ مضمون پسند آیا ہوگا، اس مضمون میں کچھ اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں، اس لیے براہ کرم ذیل کے دو پیراگراف آپ اس میں مناسب مقامات پر اضافہ کردیں، اس سلسلے میں Foot notes بھی دے رہا ہوں، انکو بھی مناسب جگہ پر جوڑ دیجیے گا۔

فارسی شعراء کا ذکر جہاں ختم ہوتا ہے وہ پیراگراف درج ذیل جملہ سے شروع ہوتا ہے:

"گذشتہ صدی کے اختتام سے قبل ہی ہندوستان میں فارسی زبان اور شاعری پر زوال آنا شروع ہوگیا تھا........"

اس پیراگراف سے پہلے عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی کے حالات اضافہ ہوں گے جو درج ذیل ہیں:

"عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی ابن محمد سعادت یار خاں ابن محمد دیدار خاں خلف حافظ رحمت خاں عبدالملک ممتاز خواہر زادہ نذیرالدین حسن شائق کے شاگرد اور بریلی کے انیسویں صدی کے آخری دور کے ممتاز فارسی و اردو گو شاعر تھے، ۱۳۰۹ھ (مطابق ۱۸۹۱ء) میں ان کا بریلی میں انتقال ہوا، نمونہ[1] کلام درج ذیل ہے:

پرورش انکساری کامراں خواہم شدن | پائمال او چو سنگِ آستاں خواہم شدن
ستم چہ کار کند گر ستم کشے نبود | جفائے تو ہمہ اے ظالم از وفائے من است
مپرس از من دلدادہ مطلب و مقصود | کہ ہر چہ آرزوئے تست مدعائے من است
عیاں ز گریۂ بے اختیار من شد راز | اگرچہ شمع بسوزی مرا سزائے من است

[1] شمع انجمن، ص ۳۳۶

عزیز کے شنود لحن عندلیب آنکس | کہ محو نغمۂ طبع سخن سرائے من است

تذکرہ پیراگراف کے آگے فارسی نثر نگاروں کا ذکر ہے، اس کے بعد کے پیراگراف کے آخر میں نواب صدیق حسن کا درج ذیل حال اضافہ فرما دیجیے۔

"فارسی زبان کے آخری اہم فارسی نثر نویس جن کا بریلی سے تعلق ہے، نواب صدیق حسن خاں ہیں[2] ان کے اجداد کا وطن قنوج تھا، لیکن ان کا ننہال بریلی میں تھا، جہاں وہ ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ (مطابق ۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے، دہلی میں تعلیم پانے کے بعد بھوپال چلے گئے، جہاں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد انھوں نے ۱۸۷۱ء میں نواب شاہجہاں بیگم سے شادی کی، اس کے بعد بھوپال کے انتظام میں ان کا اثر روز بروز بڑھتا گیا، اس بڑھتے ہوئے اثر کو کم کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے انھیں ۱۸۸۵ء میں ان کے تمام عہدوں سے ہٹا دیا، اور اس واقعہ کے پانچ سال کے بعد ۱۸۹۰ء میں ان کا انتقال بھوپال ہی میں ہوگیا، نواب صدیق حسن خاں اردو فارسی اور عربی کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن کی کل تعداد دو سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے، ان میں فارسی شعرا کے ایک اہم تذکرہ شمع انجمن کے علاوہ علوم مذہبیہ سے متعلق متعدد عربی و فارسی تصانیف ہیں جن میں سے اہم کا ذکر مولوی رحمٰن علی صاحب نے تذکرہ علمائے ہند میں کیا ہے[3]،

امید ہے کہ آپ اس تکلیف کو معاف فرمائیں گے اور جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

نیاز مند

محمد ولی الحق انصاری

[2] Encyclopaedia of Islam vol. IV P. 403-94

[3] تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۲ تا ۹۴

Persian literature (by C. A. Storey) P. 27. 913. 1137

تصانیف حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلوی

از جناب مسعود حسین صاحب نظامی ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی

حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کی ذات تعارف کی محتاج نہیں، آپ کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن ابھی تک مجھے صرف سترہ کتابوں کا پتہ چل سکا ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ حضرت اپنے تلامذہ اور مریدین کو حسب استعداد مختلف مضامین پر رسائل املا کرادیتے تھے، یہ رسائل ان ہی کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہوتے تھے، اس لیے وہ ان کو اپنے ہمراہ دور و دراز مقامات پر لیجاتے تھے، اسلیے آپ کی تصانیف ملک کے مختلف حصوں میں منتشر ہوگئیں، راقم کو ان کی جن کتابوں کا پتہ چلا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ شمس العین (۲) کشف العین (۳) نور العین (۴) مجموعہ قصائد عربیہ (۵) شرح قصائد عربیہ (۶) دیوان نیاز (۷) رسالہ راز و نیاز (۸) تحفۂ نیاز (۹) رسالہ تسمیۃ المراتب (۱۰) لیعبدون (۱۱) لیعرفون (۱۲) حاشیہ شرح جغمینی (۱۳) حاشیہ ملا جلال (۱۴) رسالہ منطق (۱۵) مجموعۂ رسائل برعلوم مختلفہ (۱۶) بیاض (۱۷) ملفوظات

حضرت شاہ نیاز بحیثیت شاعر فطرت نے حضرت شاہ نیاز کو درد مند دل عطا کیا تھا، طبیعت میں فطری سوز و گداز تھا، مکتب عشق میں ایک عشق فروش[۱] کی شاگردی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، چنانچہ اوائل عمری سے شعر گوئی کی جانب آپ کی طبیعت راغب ہوگئی، شاعری میں آپ کو کسی

[۱] "عشق فروش" سے حضرت مولانا فخر الدین محمد دہلوی قدس سرہٗ العزیز مراد ہیں۔

تلمذ حاصل نہیں تھا ؎

تعلیم اور تعلم سب ہے نیاز اپنا — شاگرد ہیں تو ہم استاد ہیں تو ہم ہیں

مفتی غلام سرور مؤلف خزینۃ الاصفیاء کا بیان ہے،

حضرت شاہ دل آگاہ بشعر رغبت تمام میداشت و اشعار آبدار متضمن حقائق و معارف گفتہ، (خزینۃ الاصفیاء ص ۵۱۲)

حضرت شاہ دل آگاہ کو شعر گوئی سے بڑی رغبت تھی، آپکے آبدار اشعار حقائق و معارف سے پُر ہوتے تھے،

آپ کا کلام عربی، فارسی، اردو اور ہندی چار زبانوں میں ہے جس کا معتد بہ حصہ راقم کی نظر سے گذرا ہے، چاروں زبانوں میں قادر الکلامی نمایاں ہے، ہر جگہ عشق کی کارفرائی ہے، "سلطان عشق" کے غلبے کا یہ عالم ہے کہ بربط جسم کے ہر تار سے "آہنگ عشق" پیدا ہے، یہانتک کہ ان کا کفر و ایمان سب کچھ عشق ہی بنجاتا ہے ؎

عشق اسلام است و دیں در ملک کفرستان عشق — کافر عشقم مپرس از دین من اے ہمنشیں

اس لیے آپ کا پورا کلام صحیفۂ عشق بن گیا ہے،

فارسی، اردو اور ہندی میں "نیاز" اور عربی میں "امی" تخلص فرماتے تھے، متعین طور پر یہ بتانا دشوار ہے کہ آپ نے پہلے کس زبان میں طبع آزمائی فرمائی حضرت مرزا مظہر جان جاناں رح کی خدمت میں جو غزل پیش کی تھی اس کی پختگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں مشق سخن شروع ہوگئی تھی،

(۱) **شمس العین** - یہ تصوف کا معرکۃ الآراء رسالہ ہے، ۱۲۰۴ھ سے قبل مکمل ہوکر قبول عام کی سند حاصل کرچکا تھا، نظر ثانی میں چاہا کہ اس کے بعض اشعار میں ترمیم کردیں، مگر اس کی مقبولیت کے پیش نظر بجنسہٖ رہنے دیا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ازبسکہ ایں رسالہ در اکثر اکناف و اطراف	چونکہ یہ رسالہ (شمس العین) اکثر اطراف و اکناف

منتشر گشتہ و از نظر بسیارے بزرگان صاحب حال	(عالم) میں پھیل گیا اور بہت سے صاحب حال بزرگوں

گذشتہ و قبولیت یافتہ و تحریف و اصلاح	کی نظر سے گذر کر قبولیت حاصل کر چکا ہو (لہذا)

صلاح کار ندیدہ بہ حال خود داشت	ترمیم و اصلاح کو مناسب نہ سمجھ کر اسے بجنسہ رہنے دیا۔

یہ پچانوے ۹۵ بند پر مشتمل خمسہ ہے، اس کے ابتدائی چار پانچ بند عربی کے ہیں، ورنہ عام طور سے چار مصرعے فارسی کے اور پانچواں مصرعہ عربی کا ہوتا ہے، ابتدائی بندوں میں عقائد بیان کیے ہیں اور اس کے بعد تصوف کے مضامین شروع ہوجاتے ہیں، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حضرت نے خود ہر بند کی تشریح تحریر اور شمس العین کی کئی شرحیں قلم بند فرمائی ہیں، جن میں سے تین میرے علم میں ہیں، ایک شرح مفصل ہے جس کو عرف عام میں شمس العین ہی کہتے ہیں، اس کی زبان فارسی ہے، اس کی دو شرحیں اور ہیں۔

(۲) **کشف العین**:۔ یہ شمس العین کی عربی شرح ہے، جسے کسی قدر اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس کا سنہ تصنیف دریافت نہیں ہوسکا، میرے پیش نظر مخطوطہ عبدالہادی مقیم سعد آباد ضلع متھرا کے قلم کا لکھا ہوا ہے، مخطوطہ کی تاریخ کتابت "تاریخ بست و ششم ماہ صفر ۱۲۹۲ھ در ج" ہے۔ یہ رسالہ اچھے روشن قلم کے تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے، کاتب رسالہ حضرت شاہ نظام الدین حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں، اس لیے اپنی معلومات کے مطابق رسالہ پر حاشیہ بھی لکھتے گئے ہیں۔

(۳) **نور العین**:۔ یہ رسالہ بھی شمس العین کی شرح کہا جاتا ہے لیکن صرف چھ سات صفحات پر مشتمل ہے، اس لیے اس کو شرح کے بجائے شرح کا تتمہ کہنا چاہیے، نواب مولوی محمد جان خاں صاحب نے راقم سے فرمایا تھا کہ اس کا ایک نسخہ ان کے پاس بھی محفوظ ہے۔

(۴) **مجموعہ قصائد عربیہ**:۔ اس مجموعہ میں تین خمسے ہیں، پہلا خمسہ پنجتن پاک کی شان میں ہے،

اس میں اکیس بند ہیں، اس کے مقطع کا بند یہ ہے:

جاء اُمّی الی جنابکمو	لیس ملجاہ غیر بابکمو

ان تعدّوہ من کلابکمو	او تنیروہ فی خطابکمو

لا یخف من مخافۃ الدارین

دوسرا خمسہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہے، اس میں بتیس ۳۲ بند ہیں، بندوں کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے، اس کا آخری بند یہ ہے:

انَّ اُمّی احمدی اولاً	قادری ثانیاً یا مرتضیٰ

ثم مسکین فقیر ثالثاً	یا علی للّٰہ عونا یا علی

بالتفات منک ھمی ینجلی

یہ خمسہ حضرت کے نبیرہ و جانشین حضرت سراج السالکین شاہ محی الدین احمد صاحب کے اردو ترجمے کے ساتھ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب الہ آبادی سجادہ نشین دائرہ حضرت ملا محمدی شاہ صاحب کی ایما سے شائع ہوچکا ہے[۱]، تیسرا خمسہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مشہور مناجات کی تخمیس ہے، یہ گیارہ بندوں پر مشتمل ہے، اس خمسہ کا پہلا اور آخری بند ملاحظہ ہو:

رب فرج ھم قلبی واکشف الغم الثقیل	انت لی فی الدین والدنیا وکیلی والکفیل

انت تواب رؤف لیس لک مثل عدیل	خذ بلطفک یا الٰہی من لہ زاد قلیل

مفلس بالصدق یاتی عند بابک یا جلیل

ان توب اللّٰہ مفتاح لابواب الفتوح	انت یا اُمّی غریب تب الیہ کالنصوح

کل من ھو جاء فی الدنیا الی العقبیٰ یروح	این موسیٰ این عیسیٰ این یحییٰ این نوح

انت یا صدیق عاصی تب الی المولی الجلیل

---

[۱] ماہ اپریل باہتمام سید احمد در مطبع رزاقی کانپور طبع گردید ۱۹۲۹ء

ان خمسوں کے علاوہ ایک اور خمسہ راقم کے پاس محفوظ ہے اس میں نوّے[۹۰] بند ہیں،
اس کے پہلے تین مصرعے فارسی کے اور دو عربی کے ہیں،

منکہ ہستم قرین بد عملی — از تباہ کاری خفی و جلی

بر درت آمدم بخستہ دلی — اعتصامی سواجنابک لی

لیس یا سیدی الی احدی

یا رسول خدا شہ ثقلین — اب خیر النساء، جد حسنین

از دل و زبان و ز شفتین — صلوٰتی علیک فی الملوین

کان متجاوزاً عن الحد دی

(۵) **شرح قصائد عربیہ:۔** اس شرح میں حضرت نے اپنے قصائد کی تشریح فرمائی ہے،
اس کی زبان شرح شمس العین کی طرح عربی آمیز فارسی ہے، اکثر و بیشتر آیات قرآنی، احادیث
اور عقائد سے متعلق صوفیائے متقدمین کے عربی جملے بے تکلف نقل کیے ہیں، جس سے کسی قدر
مشکل ہوگئی ہے،

(۶) **دیوان نیاز:۔** جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۴۹ء
میں مطبع قادری آگرہ سے شائع ہوا تھا، اسوقت پانچسو کی تعداد میں چھپا تھا اور اسکی قیمت ایک روپیہ تھی،[۱]

(۷) **دیوان نیاز فارسی و اردو:** ۱۲۶۵ھ میں سید جعفر علی بیتاب اکبرآبادی طالبعلم مدرسہ اکبرآباد کیطرف سے
یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ "نیاز کا دیوان مطبع قطب الاخبار میں بخط شیخ احمد ناز (خوشنویس کامل
شاعر شیریں زبان) باہتمام منشی محمد امیر خاں[۲] چھپنا شروع ہوگیا ہے۔ ربیع الاول کے آخر تک قیمت
ایک روپیہ، ربیع الآخر تک سوا روپیہ اور اس کے بعد ڈیڑھ روپیہ مقرر کی گئی تھی،[۳]

۱؎ ہماری زبان ص ۱، بابت ۸ جون ۱۹۶۳ء ۲؎ شاید یہ وہی امیر خاں ہیں جن کے ہاتھ کا لکھا ہوا جواہر العین ۱۴۴ صفحات
پر مشتمل دیوان نیاز اردو (سبحان اللہ گلشن) مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے، مگر مخطوطہ کے آخر میں امیر خاں نام درج ہے،
اس کا سنہ کتابت ۱۲۶۱ھ ہے، موصوف بریلی شہر کہنہ محلہ احاطہ جعفر خاں رسالدار مرحوم کے رہنے والے تھے (۱۱/۴/۸۹ / ۱۳)
۳؎ سعد الاخبار آگرہ ص ۵ بحوالہ معاصر ۱۶، اکتوبر ۱۹۴۲ء

اس وقت میرے زیر مطالعہ دیوان حضرت ملا مزمل خانصاحب سرحدی کا چھپوایا ہوا نسخہ ہے،
یہ ۱۳۴۳ھ میں آگرہ اخبار پریس آگرہ میں علامہ مکیش صاحب اکبرآبادی کی معرفت شائع ہوا تھا،[۱] یہ دیوان نیاز
کا چوبیسواں اڈیشن ہے، یہ چار زبانوں کا مختصر مجموعۂ کلام ہے جس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، پہلا حصہ
فارسی کلام پر مشتمل ہے، اس میں سب سے پہلے بانوے[۹۲] اشعار کی پُر اثر مناجات ہے، جو خال خال عربی کے
مصرعوں اور اشعار کی وجہ سے گنگا جمنی ہوگئی ہے، فارسی کی ایکسو ایک[۱۰۱] غزلوں کے علاوہ ایک غزل
ذو لسانین میں (یعنی جس کا مصرعہ اولیٰ فارسی کا اور مصرعہ ثانی عربی کا ہے) اور ایک غزل عربی میں ہے
جس میں اُمّی تخلص نظم کیا ہے، جس کا مقطع یہ ہے

جلاء العشق یا اُمّی بلاءٌ — والاٰف المصائب فیہ مشحون

پچاس اشعار کی دو مثنویاں اور چالیس[۴۴] اشعار پر مشتمل پانچ مستزاد ہیں، اس طرح فارسی حصہ
میں ایک ہزار اٹھانوے اشعار ہیں،

دوسرے حصہ میں اردو کلام ہے، اس میں اردو کی چھپن[۵۶] غزلیں اور چار سو سرسٹھ[۴۶۷] اشعار
ہیں، تیسرے حصے میں ہندی کلام ہے، اس کی زبان اور مضامین پڑھ کر ہندی کلاسکی دور کے نامور
شاعر ملک محمد جائسی کی پدماوت کے بارہ ماسہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اس حصہ میں پچیس[۲۵] ہولیاں اور ایک بھاگ ہے،
مجھے ایک کابلی دوست نے بتایا تھا کہ دیوان نیاز بے نیاز کا ماضی قریب میں ایک اڈیشن لاہور سے طبع
ہوا ہے، اس کا ایک نسخہ ان کے پاس بھی ہے، بعد میں دوسرے ذرائع سے پتہ چلا کہ دیوان کا یہ اڈیشن حضرت
کے سلسلے کے خلیفہ حضرت صاحبزادہ شاہ فتح محمد صاحب مقیم سندھ کے زیر اہتمام زیور طبع سے آراستہ
ہوا ہے، یہ گویا دیوان کا پچیسواں اڈیشن ہے،

آپکے اشعار کی مقبولیت کا اندازہ اڈیشنوں سے لگایا جاسکتا ہے، آپکے معاصرین سے لیکر
ابتک بہت سے صاحبان قلم نے آپکے اشعار سے اپنے مضامین کو مزین کیا ہے، اتنا زمانہ بیت جانے کے

۱؎ مراسلہ حضرت مکیش صاحب، ہماری زبان ۱۰، جون ۱۹۶۳ء ص ۶

باوجود آج بھی حضرت کے نغموں کے سر دھم نہیں پڑے، اس بیسویں صدی میں مقبولیت کا یہ عالم ہو کہ
بقول حضرت سبکش آج بھی کوئی عرس و قوالی کی محفل ایسی نہیں ہوتی جہاں حضرت کی غزلیں قوال نہ
گاتے ہوں،[5] بیسویں صدی کے مصنفین میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے لیکر عظیم بیگ چغتائی
اور شوکت تھانوی تک ہر مذاق کے لوگ اپنی تقریروں اور تحریروں میں نقل کرتے چلے آرہے ہیں،

اس شہرت و مقبولیت کے باوجود ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے تاشقند میں حضرت نیاز کے دیوان کا
ایک غلط سلط نسخہ دیکھ کر استعجاب فرمایا تھا اور لکھا تھا کہ "اگر شاہ نیاز سرہندی کا اردو کلام ابتک
شائع نہیں ہوا ہے تو پھر جس طرح بھی ہوگا میں اسے مرتب کرکے پیش کرنے کی کوشش کرونگا،[6] مجھے
حیرت ہے کہ جس دیوان کے کم از کم پچیس ۲۵ اڈیشن نکل چکے ہوں، اس سے ڈاکٹر صاحب بالکل بے خبر ہوں،
فاضل محقق کو "آب حیات اور دوسرے مستند تذکروں میں حضرت کا ذکر نہیں ملا"، کہ مکتوب کی
عبارت میں سہو ہوا ہے، ورنہ اصل عبارت تو یوں ہونی چاہیے تھی کہ "آبحیات" اور اسی جیسے
"دوسرے مستند تذکروں میں مجھے حضرت کا ذکر نہیں ملا"، تو یہ بات قابل یقین بھی تھی، اگر جناب محقق
ذرا زحمت گوارا فرماتے تو خود تاشقند اور اس کے اطراف و جوانب میں قوقند، سمرقند، بلخ و بخارا
میں حضرت کی بعض شاہکار تصانیف دستیاب ہو جاتیں، ان مقامات پر آپ کے اجل خلفاء تھے جہاں
ان کی بڑی بڑی خانقاہیں ہیں حضرت کے وصال کے مدتوں بعد تک خانقاہ نیازیہ بریلی میں ان
خلفاء کے خلفاء و متوسلین کی آمد و رفت رہی ہے، حضرت سبکش اپنے اسی مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں
کہ وہاں کے بعض اہل سلسلہ اور مشائخ کو میں نے خود دیکھا اور انکی صحبت سے لطف اندوز ہوا ہوں"،[7]

(۷) رسالہ راز و نیاز: یہ دس بارہ صفحے کا رسالہ ہے، اس کا موضوع تصوف ہے، زبان
عربی آمیز فارسی ہے، اس کے پہلے جز میں مراتب کلیہ ہیں، اور دوسرے جز میں فخریہ سلسلے کے مروجہ

---

[5] ہماری زبان ص ۶ بابت ۸ جون ۶۳ء [6] رسالہ سبکش [7] ایضاً ۲۲ مئی ۶۳ء ص ۹۹ مضمون سوتیا جاہ

اشغال بیان فرمائے ہیں، اور آخر میں اپنی مثنوی کے اشعار پر رسالہ ختم کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

ذکر بے کام و بے زبان اوراست — امر بی است روح و سر خداست

(۸) تحفہ نیازیہ حضرت بے نیاز۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہے اور زبان فارسی ہے،
یہ رسالہ منتہی طلبہ کے لیے لکھا گیا تھا،

(۹) رسالہ تسمیۃ المراتب: یہ رسالہ بھی تصوف پر ہے،

(۱۰) لیعبدون
(۱۱) لیعرفون
} یہ دونوں رسالے مختصر ہیں، لیکن ان میں نہایت مؤثر انداز سے عبدیت و معرفت پر بحث کی گئی ہے۔

(۱۲) حاشیہ شرح چغمینی: طلبہ کے لیے لکھا گیا تھا، مگر اب نایاب ہے،

(۱۳) حاشیہ ملا جلال: اس کی زبان عربی ہے، حضرت مولوی محمد فائق صاحب
فرماتے ہیں کہ "ملا جلال وغیرہ پر آپ کے حواشی آپ کے فاضل ہونے کی دلیل ہیں"،[1]

(۱۴) رسالہ منطق: یہ رسالہ حضرت شاہ آل رسول صاحب مارہروی کے لیے
املا کرایا تھا، شاہ صاحب نے آپ سے تعلیم کی تکمیل کی تھی، مؤلف ناز و نیاز نے لکھا ہے کہ
"یہ رسالہ کتب خانہ مارہرہ میں میں سنتا ہوں ابتک موجود ہے"،[2]

(۱۵) مجموعۂ رسائل بر علوم مختلفہ:۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مجموعہ بھی
حضرت شاہ آل رسول صاحب کے لیے اپنے دست خاص سے تحریر فرمایا تھا اور اب بھی خانقاہ
نیازیہ کی کتابوں میں موجود ہے،

(۱۶) بیاض: اس کی زبان فارسی ہے، مؤلف کرامات نظامیہ نے اس کی
ایک عبارت نقل کی ہے جس میں حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کی تاریخ

---

[1] کرامات نظامیہ ص ۱۳، [2] ناز و نیاز ج ۱ ص ۱۷

حضرت مولانا فخر صاحب کے اسفار، دہلی میں قیام اور ان کا سنہ رحلت درج ہے۔[1]

(۱۷) **ملفوظات نیاز بے نیاز**: اس کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایکبار دیوان نیاز کے مختلف اڈیشن دیکھ رہا تھا، اسی دوران میں جیبب گنج کلکشن میں مجھے دیوان نیاز کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا جس کے ابتدائی صفحات پھٹے ہوئے تھے، ان اوراق کے بجائے مالک دیوان نے دوسرے سادہ اوراق لگاکر ان پر اپنے قلم سے غزلیں نقل کردی ہیں، صفحہ اول پر اسی قلم سے یہ عبارت تحریر ہے، "تاریخ وفات این بزرگان از ملفوظات شاہ نیاز احمد قدس سرہ" اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ متوسلین میں سے کسی شخص نے حضرت کے ملفوظات جمع کیے تھے، اس عنوان کے تحت گیارہ تاریخہائے وفات درج ہیں، سب سے آخری تاریخ "حضرت حکیم الٰہی حاجی محمد رحمۃ اللہ کہ پدر بزرگوار این فقیر بودہ ۵ رجادی الاول" ہے، اس عبارت کے بعد ایک طرف حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں سے ایک عبارت نقل کی ہے اور آخر میں یہ عبارت درج ہے:

"کتبہ الراجی الی رحمۃ الالٰہ المدعو بامیر شاہ صانہ دعما شانہ"[2]

---

[1] کرامات نظامیہ ص ۳۲ [2] امیر شاہ کے بارے میں میں نے ہر چند غور کیا لیکن امیر شاہ صاحب بدخشانیؒ کے سوا اور کوئی صاحب اس نام کے یاد نہیں آئے، امیر شاہ صاحب حضرت مجنون شاہ صاحب کابلی (خلیفہ حضرت تاج الاولیا، شاہ نظام الدین حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے مرید اور حضرت شاہ محی الدین احمد صاحب سے اجازت یافتہ تھے، حضرت موصوف بڑے صاحب تصرف بزرگ تھے، آپ کے دم سے افغانستان میں سلسلۂ نیازیہ کی بڑی اشاعت ہوئی، آجکل ان کے دوسرے صاحبزادے آغا غلام علی شاہ صاحب ساکن بدخشاں اشاعت سلسلہ میں مشغول ہیں۔

باب التقریظ والانتقاد

مَعَاشرتی و علمی تاریخ

مُصنفہ

ڈاکٹر سید معین الحق صاحب (کراچی)

از

جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی

تاریخ اب سے پہلے واقعات کی روداد اور وہ واقعات جن لوگوں کے ذریعہ ظہور میں آئے اُن کے حالات کا نام تھا، اس کے بعد سائنس نے تاریخ میں دخل پایا اور تاریخ نے سائنس کے معاشرتی و عمرانی شعبے کی صورت اختیار کرلی، اور واقعات کی تحقیق اور چھان بین اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی مدد سے شروع ہوئی، اور استنباط نتائج پر زور دیا گیا، یہ عمل بھی زیادہ تر واقعات کی ترتیب و تدوین ہی تک محدود رہا، لیکن آجکل تاریخ کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کیا جارہا ہے وہ پہلے سے بالکل مختلف ہے، اب تاریخ محض مختلف ملکوں اور قوموں کی باہمی جنگوں کے حالات اور بادشاہوں اور حکمرانوں کے شاندار کارناموں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ زور اس امر پر دیا جاتا ہے کہ مختلف ملکوں اور قوموں کے واقعات و سانحات کا تمام عالم پر من حیث المجموع کیا اثر پڑا ہے، اور مختلف ملکوں اور قوموں کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں چند مخصوص واقعات نے کس طرح مدد دی ہے، دنیا کے تمام ملکوں میں تاریخی واقعات

کی ایک بڑی حد تک یکسانیت نے تاریخ نویسی کا رخ انسان کے اخلاقی اور روحانی اتحاد کی طرف پھیر دیا ہے، اسلام نے دنیا میں پہلی مرتبہ سارے عالم کے اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور تمام انسانوں کی مساوات کا نعرہ بلند کیا، رنگ و نسل کے فرق کو مٹایا، آقا اور غلام کو ایک سطح پر لاکر کھڑا کر دیا اور ساری دنیا کے باشندوں کو پائیدار اتحاد و یکجہتی کا راستہ دکھایا، اسلام دنیا کے کسی مخصوص حصے یا کسی مخصوص قوم کی نجات اور رہنمائی کے لیے نہیں بلکہ سارے عالم کی نجات اور رہنمائی کے لیے رونما ہوا، اور اس نے قریب قریب دنیا کے تمام ملکوں میں اخلاقی اور روحانی اصلاح کی بنیاد ڈالی، اور نسل انسانی کو پستی اور ضلالت سے نکالکر راہ راست پر ڈالا، اور اسلامی کلچر سے مالا مال کیا، انسان دوستی اور مسلک انسانیت اور انسانی فلاح و بہبود کا عام جذبہ پیدا کرنے میں اسلام نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی،

تاریخ نویسی ہمیشہ مسلمانوں کا خاص مشغلہ رہا، انھوں نے تاریخ نویسی کے فن کو اتنی ترقی دی کہ ترقی یافتہ دنیا کے جدید ترین مورخ بھی اس پر آج تک کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں کر سکے، اس میں شک نہیں کہ عموماً مسلم مورخوں نے حکمرانوں کے کارناموں اور سیاسی اور جنگی سرگرمیوں اور فتوحات پر زیادہ زور دیا ہے، اس لیے کہ وہ شخصی حکومتوں کا دور تھا، اور اس زمانے میں ان ہی چیزوں کو اہمیت حاصل تھی لیکن جدید دور میں تاریخ نویسی کے متعلق جس نقطۂ نظر کو اہمیت دی جا رہی ہے وہ بھی مسلمان مورخوں سے پوشیدہ نہ تھا، بلا شبہہ ان کی تاریخوں میں معاشرتی، معاشی اور ثقافتی پہلوؤں پر سوائے ہلکے ہلکے اشاروں کے اور کچھ نہیں ملتا، لیکن اس کی تلافی ہمارے صوفیائے کرام نے کر دی، جو ہمیشہ روحانی تربیت اور دینی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح میں مصروف رہتے تھے، ان کے ملفوظات اور تذکروں

میں ہمیں قریب قریب ہر دور کے اخلاقی اور روحانی اور معاشرتی حالات دستیاب ہو سکتے ہیں، ان ماخذوں سے حالات فراہم کرنے کی خدمت انجام دینے کے لیے بڑی محنت اور تلاش و جستجو کی ضرورت ہے، اسی موضوع پر حال ہی میں ایک کتاب "معاشرتی و علمی تاریخ" کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس میں ہندوستان کی ۱۲۰۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کی معاشرتی، علمی، ثقافتی اور اقتصادی زندگی کے حالات اور واقعات بہت تحقیق و تدقیق کے بعد پیش کیے گئے ہیں،

ڈاکٹر سید معین الحق جنھوں نے یہ نہایت اہم اور مشکل کام انجام دیا ہے اور ہماری تاریخ کو تاریخ کے جدید ترین تصورات کے مطابق بنا دیا ہے، طالب علمی کے زمانہ ہی سے تاریخی و علمی ذوق کے لیے ممتاز رہے ہیں، ان کی اس تازہ ترین کتاب میں ان کے عمیق مطالعے اور ان کی تحقیق و تدقیق کا قدم قدم پر ثبوت ملتا ہے، اسلامی ہند میں تاریخ کے ہر دور میں زندگی کے معاشرتی، معاشی، علمی اور ثقافتی پہلوؤں پر نہایت مفید معلومات، "معاشرتی و علمی تاریخ" کے ہر صفحہ پر موجود ہے، اعلیٰ معیاری اور ایسے ہم عصر ماخذوں کا تجزیاتی مطالعہ جس میں بربنائے اعتقاد غلط اور ناقابل اعتبار روایتیں کثرت سے شامل ہو گئی ہیں، نہایت ہی دشوار کام تھا، اس کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ ان کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں ہماری مستند معاشرتی، علمی اور ثقافتی تاریخ مرتب ہو گئی، جس کے اجزا سیکڑوں کتابوں کے اوراق پر بکھرے پڑے تھے، یہ ایک وسیع و نازک کام تھا، ہو سکتا ہے کہ کسی دور کے دو چار علماء کے نام اس کتاب میں نہ لیں یا بعض مشائخ کے متعلق چند روایتیں اس میں جگہ نہ پا سکی ہوں، کتاب کے محدود حجم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ معمولی فروگذاشتیں قابل اعتنا نہیں ہیں،

اس کتاب کے مطالعے سے علماء وصوفیائے کرام کی تبلیغی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ

ہو جاتا ہے، لیکن تاریخ نویسی کے جدید رجحانات اور تصورات کا تقاضا تھا کہ ڈاکٹر صاحب یہ واضح کرتے کہ اسلامی نظریات کا اثر غیر اسلامی زندگی پر کیا پڑا اور اسلام اور مسلمانوں نے غیر مسلموں کی ثقافت اور معاشرت اور فنون لطیفہ اور تعمیرات اور طرز زندگی پر کیا اثرات چھوڑے اور اس ملک کے باشندوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور چھوت چھات کو مٹانے اور مساوات پیدا کرنے میں کہاں تک یہ اثرات کارگر ہوئے، اور روحانی و اخلاقی اتحاد پیدا کرنے میں ان اثرات نے کیا مدد دی، مجھے امید ہے کہ کتاب کے اگلے اڈیشن میں ڈاکٹر صاحب اس کمی کو پورا کر دینگے،

کتاب کی زبان اور طرز بیان بہت واضح شگفتہ اور دلکش ہے، اور واقعات اور حالات کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، تحریر کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کو متاثر کرے، خاص طور پر تاریخی واقعات کا طرز بیان ایسا ہونا چاہیے کہ مورخ پر اعتماد و یقین پیدا کر سکے، ڈاکٹر صاحب کے اسلوب بیان میں یہ بات بدرجۂ اتم موجود ہے، انھیں دوسروں کے لیے سوچنے کی مہارت ہے، ایک بات مجھے اور عرض کرنی ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس دور کے ہندوستان کے لیے "ہند پاکستان" کا ایک نیا نام وضع کیا ہے، میرے نزدیک تاریخی نقطۂ نظر سے یہ نام اچھی خاصی الجھن پیدا کر سکتا ہے، تاریخ تو یہ کہتی ہے کہ اس کتاب میں جو واقعات و حالات بیان کیے گئے ہیں وہ ہندوستان کے واقعات و حالات ہیں، ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندوستان کے، جب پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا، اس لیے وہ حالات "ہند پاکستان" کے نہیں بلکہ متحدہ ہندوستان کے ہیں،

ادبیات

غزل

از جناب تسکین قریشی

میرے عشقِ کامل میں حسن بھی ادا بھی ہے ۔۔۔ میں نے دل دیا بھی ہے میں نے دل لیا بھی ہے
عاشقی و محرومی، جبر بھی جزا بھی ہے ۔۔۔ زخم ہی نہیں دل میں، زخم میں مزا بھی ہے
اہلِ دل بھی کہتے ہیں، اور یہ واقعہ بھی ہے ۔۔۔ کفر، کفر ہے لیکن، عشق میں روا بھی ہے
حسن ہو اگر برہم، اور چھیڑیے پیہم ۔۔۔ برہمی کے عالم میں لطفِ التجا بھی ہے
شکر کیا، شکایت کیا، خیر ہو محبت کی ۔۔۔ وہ جو دشمنِ جاں ہے، جانِ مدعا بھی ہے
بیخودی کا پیمانہ، میکشی نہیں اے دوست ۔۔۔ بیخودی اسی کی ہے، جو خود آشنا بھی ہے
عقل و آگہی بھی گم، ہوش و بیخودی بھی گم ۔۔۔ تیری یاد کی اے دوست کوئی انتہا بھی ہے

توبہ بارہا ٹوٹی، دل نہ ٹوٹنے پائے
جتنا رند ہے تسکیںؔ اُتنا پارسا بھی ہے

غزل

از جناب افتخار احمد صاحب فخرؔ دھولیاوی ایم اے، ایم جے کالج جلگاؤں

کیا کرم فرما نگاہِ باغباں ہونے لگی ۔۔۔ باغ سے شاخِ نشیمن بے نشاں ہونے لگی
شامِ غم، جب چشمِ نم، گوہر فشاں ہونے لگی ۔۔۔ درہم و برہم بساطِ کہکشاں ہونے لگی

جب محبت ان کی آنکھوں سے عیاں ہونے لگی — بات بڑھتے بڑھتے زیبِ داستاں ہونے لگی

کچھ توجہ تیری اے نامہرباں ہونے لگی — زندگی اب زندگی کی ترجماں ہونے لگی

یوں جبینِ شوق جذبِ آستاں ہونے لگی — ہیچ، نظروں میں متاعِ دو جہاں ہونے لگی

ہو گئی ہیں انکے دل کی دھڑکنیں بھی تیز تیز — داستانِ غم جب آنکھوں سے بیاں ہونے لگی

رہگذارِ عشق میں ایسا بھی اک آیا مقام — بیخودی ہی اپنی جب خود منزل نشاں ہونے لگی

گل گریباں گیر ہیں خارِ چمن دامن کشاں — تیرے دیوانے کی ہر شے قدرداں ہونے لگی

پا گئی کیا نکتۂ "لولاک" کو عقلِ رسا — زندگی جو شرحِ رازِ "کن فکاں" ہونے لگی

کون مجبورِ الم؟ اے فخر! تڑپا شامِ غم
پست و بالا ہستیٔ کون و مکاں ہونے لگی

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

حسن وہ جلوہ جو دیکھے وہی حیراں ہو جائے — عشق وہ آگ جو رگ رگ سے نمایاں ہو جائے

وہ گنہگارِ محبت ہوں کہ زاہد پہ اگر — میرا سایہ بھی جو پڑ جائے تو انساں ہو جائے

جب میں سمجھوں ترا اعجاز کہ اے دستِ جنوں — آج دامن کا ہر اک تار گریباں ہو جائے

واعظِ تفرقہ پرور سے تو مل جائے نجات — کفر ہی کاش مرا حاصلِ ایماں ہو جائے

آہ وہ خار جو پھولوں کی نظر میں کھٹکے — ہائے وہ سبزہ کہ جو صرفِ بہاراں ہو جائے

عمر بھر کے لیے کافی ہے اگر اے جوہر
ایک سجدہ بھی قبولِ درِ جاناں ہو جائے

مطبوعات جدیدہ

عقلیات ابن تیمیہ - مرتبہ مولانا محمد حنیف ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۴۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت اخباری کاغذ ۹ر، سفید کاغذ ۱۰ر

پتہ ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا ایک اہم اصلاحی و تجدیدی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے منطق، فلسفہ اور علم کلام کی تنقید و احتساب کرکے کتاب و سنت کے طرز و اسلوب کی عظمت و دلنشینی ثابت کی ہے، اس کتاب میں ابن تیمیہ کی بعض کتابوں کی روشنی میں ان کے اسی کارنامہ کی ترجمانی اور تشریح کی گئی ہے، پہلی فصل میں منطق کے مسائل مثلاً حدود و تعریفات، مقولات عشرہ، تصور و تصدیق، صغریٰ کبریٰ اور حد اوسط وغیرہ کے متعلق ارسطو کے خیالات پر تنقید ان کو ذکر کرکے منطق کی عدم افادیت، عقلی علوم میں قطعی و یقینی نتائج تک اس کی نارسائی اور دینی و الٰہی حقائق کے بارہ میں اس کا عجز علمی و عقلی انداز میں ثابت کیا گیا ہے، شارح نے حدود و تعریفات کے ارسطاطالیسی تصور پر حکمائے مغرب کا نقد نقل کرکے دکھایا ہے کہ یہ علامہ ہی کے اعتراض کی صدائے بازگشت ہے، شروع میں انھوں نے منطق کی ابتداء اور ارتقاء، عربی زبان میں عقلی علوم کے ترجمہ و اشاعت اور اسلامی علوم اور مسلمان حکماء و متکلمین پر ان کے اثرات وغیرہ کی مختصر وضاحت کرکے ابن تیمیہ کے اصلاحی کارناموں کی عظمت ظاہر کی ہے، دوسری فصل میں مرتب نے اہم اسلامی فرقوں کے متعلق مختصر معلومات تحریر کیے ہیں، تیسری فصل میں مسئلۂ الٰہیات

اور چوتھی میں صفات باری کے متعلق فلاسفۂ یونان و اسلام اور مسلمان متکلمین کے طرز استدلال کی خامیوں کو واضح کر کے سمعیات پر عقلیات کو ترجیح دینے کے رجحان کی مذمت، کتاب و سنت کا قابل ترجیح اور موافق عقل ہونا اور قرآن کے طرز استدلال کی دلنشینی اور اس کے بعض دلائل کی تشریح کی گئی ہے، پانچویں، چھٹی اور ساتویں فصلوں میں رویت باری، خلق قرآن اور جبر و قدر کے مسائل میں علامہ ابن تیمیہ نے جمہور اہل سنت کے نقطۂ نظر کی اپنے خاص اسلوب میں صحت و وضاحت کی ہے، اس کا ذکر ہے، آخری فصل میں تصوف پر ان کے عقلی و مذہبی اعتراضات کا ذکر ہے، اور اس سلسلے میں ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور ولایت کی نبوت پر فوقیت کو غیر اسلامی اور وحی و نبوت کے مقابلہ میں کشف کو علم و ادراک کا یقینی ذریعہ قرار دینے کی تردید کی گئی ہے، ابن تیمیہ کی تنقیدوں کا اب و لہجہ بڑا سخت ہے، مرتب نے اس کی توجیہ کی ہے، اور ان کے حریفوں کی جانب سے بھی ایک حد تک عذرخواہی کی ہے، علامہ کے اعتراض و جواب میں جو تکرار و اعادہ ہے اس کی بھی توجیہ کی گئی ہے، مگر خود زیر تبصرہ کتاب میں بھی کہیں کہیں یہی چیز پائی جاتی ہے، بعض مسائل میں شارح نے ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف اور کہیں کہیں ان کی تشریح و تعبیر میں اضافہ بھی کیا ہے، اس کتاب میں اہم اور دقیق مسائل پر مباحث ہیں، لیکن مرتب کے شگفتہ قلم اور سلیس طرز تحریر نے اس میں شگفتگی و سلاست پیدا کر دی ہے، تاہم اس کے بعض مسائل عوام کی دسترس سے باہر ہیں، اس کتاب سے علامہ ابن تیمیہ کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی وضاحت بڑی حد تک ہو جاتی ہے،

دیوان شعر بشار بن برد - مرتبہ مولانا سید بدر الدین علوی مرحوم، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۲، قیمت درج نہیں، پتہ دار الثقافت بیروت۔

بشار عباسی دور کا ایک مشہور، صاحب دیوان شاعر تھا، لیکن اس کا مکمل دیوان اب تک

نایاب و معدوم ہے، مولانا بدر الدین علوی مرحوم سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی نے اس کے انتخاب کو جو خالدیان کے نام سے مشہور ہے، ۱۹۳۴ء میں المختار من شعر بشار کے نام سے تصحیح و تعلیق کے بعد شائع کیا تھا، اور اسی زمانہ سے انھوں نے مختلف کتابوں سے اس کے اشعار جمع کر کے مستقل دیوان کی جمع و ترتیب کا کام شروع کر دیا تھا، اور اس کو اپنی زندگی میں ترتیب و تحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ مرتب کر چکے تھے، جو ان کی وفات کے بعد اب شائع ہوا ہے، اس درمیان میں طاہر یونس وغیرہ کے بعض فضلا نے بھی دیوان بشار شائع کیا ہے، لیکن زیر تبصرہ دیوان جو اگرچہ بشار بن برد کے کلام کا مکمل مجموعہ نہیں ہے، تاہم کلام بشار کے اب تک جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اُن میں یہ مجموعہ اس لحاظ سے سب سے جامع و مکمل ہے کہ وہ ہمزہ و الف سے لیکر یا تک پر مشتمل ہے، فاضل مرتب نے اس دیوان میں سالہا سال کی محنت و تلاش کے بعد بشار کے تمام اشعار کو جو ادب و محاضرات کی مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے، ایک ایک کر کے جمع کر دیا ہے، اور حاشیہ میں ان کتابوں کا حوالہ بھی دیا ہے، جہاں سے وہ لیے گئے ہیں، مختلف مآخذ میں روایات کے اختلاف اور الفاظ وغیرہ کا فرق بھی دکھایا گیا ہے،

دیوان بشار کے مختلف اصناف کلام یعنی مدح و ہجو، تشبیب و غزل، پند و نصائح اور مرثیوں وغیرہ پر مشتمل ہے، کتاب کے آخر میں کئی فہرستیں ہیں، سب سے آخر میں زیادات و استدراکات کے عنوان سے بشار کے کچھ مزید اشعار، دو مختصر نثری تحریریں اور بعض حوالجات درج ہیں جو جرمن مستشرق فیوک کے قلم سے ہیں، اس دیوان کی اشاعت سے عربی ادب کی مفید خدمت انجام پائی ہے، امید ہے کہ عربی شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے اس کی پوری قدردانی کریں گے۔

آثار الصنادید - از سر سید احمد خاں مرحوم، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]، پتہ پاکستان

ہسٹاریکل سوسائٹی، ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۔ ۵

سرسید احمد خاں مرحوم کی مشہور کتاب آثار الصنادید جو دہلی کے آثار قدیمہ کی نہایت مستند اور جامع تاریخ ہے، مدتوں سے نایاب تھی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سکریٹری اور البصائر کے مدیر ڈاکٹر معین الحق نے بڑے اہتمام اور مفید حواشی کے ساتھ اس کو مرتب کیا ہے، اس کے شروع میں ان کے قلم سے ایک پر از معلومات مقدمہ اور آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے، مقدمہ میں سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کے زمانہ میں فن تعمیر کی ترقیوں اسکی خصوصیات اور اس سے ان کی دلچسپی وغیرہ کا ذکر ہے، ضمیمہ مشہور عمارتوں کے کتبوں پر مشتمل ہے جو محکمہ آثار قدیمہ ہند کے ڈپٹی ڈائرکٹر مولوی ظفر حسن صاحب کی فہرست سے ماخوذ ہیں، اصل کتاب میں عمارتوں کے جو نقشے تھے ان کے بجائے اس میں صرف اہم عمارتوں کے فوٹو دیے ہیں، اس طرح ڈاکٹر صاحب نے اس کو اور زیادہ مفید اور دیدہ زیب بنادیا ہے۔

اٹھارہ سو ستاون اخبار اور دستاویزیں مرتبہ جناب عتیق صدیقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۴۴ مجلد قیمت عنہ پتہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی۔

ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ۱۸۵۷ء ایک اہم اور یادگار تاریخی سال ہے، اس سال ہندوستانیوں کی جنگ آزادی اور انگریزوں کی غلامی کے خلاف ملک گیر احتجاج میں اس زمانہ کے ہندوستانی اخباروں کا بھی بڑا حصہ تھا، جن سے اس دور کی تاریخ کی ترتیب میں بڑی مدد مل سکتی ہے، لیکن ان کی اکثر فائلیں اب موجود نہیں رہیں، عتیق احمد صدیقی صاحب جن کی کئی کتابیں قدیم اخبارات پر شائع ہو چکی ہیں، بڑی محنت و جانکاہی سے اس کتاب کے پہلے حصہ میں ۱۸۵۷ء کے سراج الاخبار، دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار اور اخبار الظفر وغیرہ کے

اقتباسات بحوالہ تاریخ جمع کر کے دکھایا ہے کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات بھڑکانے میں ان کا کتنا حصہ رہا ہے، دوسرے حصہ میں اس زمانہ کی مختلف دستاویزوں کو جن میں پہلی جنگ آزادی کے مجاہدوں کی تحریریں، خطوط، اشتہارات اور بعض سرکاری مراسلے وغیرہ شامل ہیں جمع کیا گیا ہے، بعض اقتباسات اور اکثر دستاویزوں کے عکس بھی دیے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب بہت ہی پر از معلومات ہو گئی ہے، جو مورخین ہند کے لیے مفید اور مستند ماخذ بن جائیگی۔

مطالعہ مثنوی گلزار نسیم ۔ مرتبہ جناب منظر احمد صاحب لاری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر صفحات ۱۲۳، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۱۲ پیسے، پتہ آل انڈیا میر اکیڈمی، ۶، حامد روڈ، لکھنؤ۔

اس کتاب میں اردو کی مشہور مثنوی گلزار نسیم کا تجزیہ کر کے اس کے کردار، مکالمہ، منظر نگاری، ایجاز و اختصار اور زبان و بیان وغیرہ کی خوبیاں اور پلاٹ کے بعض نقائص مثالوں کے ذریعہ دکھائے گئے ہیں، مثنوی کے اندر جو چیزیں مافوق العادت ہیں، ان پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، شروع میں پنڈت دیا شنکر کول نسیم کے مختصر حالات، قصہ کا خلاصہ اس کے ماخذ اور مثنوی پر مولانا حالی مرحوم کے اعتراضات اور چکبست کے جوابات درج ہیں، یہ کتاب نہ صرف طلبہ کے لیے مفید ہے، بلکہ عام مطالعہ کے لیے بھی دلچسپ ہے۔

منارۂ نور ۔ از جناب ڈاکٹر نظام الدین صاحب نظامؔ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۷۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت سے ۳ پتہ دارالاشاعت اسلامیہ ۵۳ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۱

یہ ڈاکٹر نظام الدین نظام کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے، اس میں چند قطعات و رباعیات بھی ہیں، اس کی اکثر نظموں میں غلط اور فرسودہ رسم و رواج، فرقہ واریت اور موجودہ دور کے

دوسرے ناہموار اور ابتر معاشرتی و سیاسی حالات کی اصلاح و تعمیر کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، انکی نظمیں ان کے قابل قدر مذہبی و اخلاقی جذبات و خیالات کی آئینہ دار ہیں، ان سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی اور اخلاقی مریضوں کے بھی نبض شناس ہیں، انداز بیان سادہ ہے لیکن مصنف کے خلوص و صداقت کی وجہ سے ان کی نظموں میں اثر پیدا ہوگیا ہے۔

(۱) چین میں اسلام کا ماضی و حال
(۲) ببول کے پیڑ
از ڈیوڈ لو اور شینلے کارناؤ، مترجمہ جناب گوپال متل صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۶۴، ۷۲، قیمت ۴۰ و ۵۰ پیسے، نیشنل اکیڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی، ۶

پہلے کتابچہ میں اسلام کی چین میں آمد، وہاں کی تہذیب و ثقافت کی تعمیر و تشکیل میں اس کے اثرات مختلف حکومتوں کے زمانہ میں مسلمانوں کے حالات اور موجودہ کمیونسٹ حکومت میں انکے اضطراب اور کمیونسٹوں کے مظالم وغیرہ بیان کیے گئے ہیں، یہ کتابچہ ایک مسلمان چینی کے قلم سے ہے اسلیے مختصر ہونے کے باوجود قابل مطالعہ ہے۔

دوسرے کتابچے میں ایک چینی کسان کی آپ بیتی ہے جس نے کمیونسٹ حکومتوں کے زمانہ میں اپنے خاندان اور گاؤں کے معاشرتی اور مزرعی حالات ذکر کرنے کے بعد اپنے ترک وطن کا ذکر کیا ہے، یہ آپ بیتی دلچسپ اور سبق آموز ہے اس میں کمیونسٹوں کے ظلم، تشدد، جبر اور شخصی ملکیتوں کے خاتمہ وغیرہ پر ایک پُرمغز تبصرہ بھی ہے، دونوں کتابچوں سے کمیونزم کے اصلی خد و خال اور اس کے امن پسندی کے جھوٹے دعوے کی حقیقت پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے، ترجمہ کی سلاست و شگفتگی کے لیے لائق مترجم کا نام ہی ضمانت ہے۔

'ض'

جلد ۹۹ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۷ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات